ضروری اعلان

۱۔ اگر جنوری ۳۸ء سے اس وقت تک کے مسلسل پرچے آپ کے پاس نہیں ہیں تو اب طلب فرمالیجئے، تاکہ اسلامی ہند کی تاریخ اور نغمۂ کارواں (دونوں کتابیں) آپ کے پاس مکمل ہوجائیں۔ یہ کتابیں علٰحدہ کتابی صورت میں شایع نہ ہوں گی

۲۔ چونکہ اسلامی ہند کو دسمبر ۳۸ء تک ختم کردینا ہے، اس لئے "نغمۂ کارواں" کی اشاعت فی الحال ملتوی کرکے "اسلامی ہند" کے صفحات میں اضافہ کردیا گیا ہے

منیجر نگار

جلد (۳۴)	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۸ء	شمار (۳)

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری ---------- فضل حسین تبسم ---------- ۹

سیاسیات یورپ ---------- اڈیٹر ---------- ۲۵

اقبال کی نگاہ میں عورت کی حیثیت ---------- سعید جعفری (ام۔اس۔سی) ---------- ۳۲

روایت و معجزہ کا دور ---------- اڈیٹر ---------- ۴۰

اگر دنیا میں ڈاکٹر نہ ہوتے ---------- رشید احمد صدیقی ---------- ۴۷

مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۵۲

باب الاستفسار ---------- اڈیٹر ---------- ۵۵

مطبوعات موصولہ ---------- اڈیٹر ---------- ۵۸

منظومات ---- امید امیٹھوی۔ شہاب سرمدی۔ ہادی مچھلی شہری۔ دل شاہجہاں پوری ---------- ۶۳

اسلامی ہند ---------- اڈیٹر ---------- ۲۱۱

اصلی برقی قوام (تمباکو خوردنی قیمتی فی تولہ ۱۲ عدد) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا۔ **شیخ خورشید علی** پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے ملسکتا ہے

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر شریک نہ ہوگا۔
ضخامت و قیمت سوا مل نہ ہوگا۔

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴	ستمبر ۳۸ء	شمارہ ۳

ملاحظات

وارد ھا اسکیم اور مولانا سید سلیمان ندوی

ابتدائی حصہ تعلیم کی جو اسکیم گاندھی جی کے مشورہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ دہلی نے مرتب کی ہے، اسے "وارد ھا اسکیم" کہتے ہیں اور اس کا مقصود یہ ہے کہ ابتدا ہی سے بچوں میں کچھ کام کرنے کا شوق پیدا ہو جائے اور بڑے ہو کر وہ صرف نوکری ہی کی توقع پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ جائیں

جس وقت یہ اسکیم شایع ہوئی تھی میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ہمارے یہاں کے علماء کرام حسب عادت ضرور اس میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا کر کے مسلمانوں کو اس کا مخالف بنا دیں گے اور آخر کار یہ اندیشہ پورا ہو کر رہا

عام طور پر علماء کی تقسیم علماء سوء و علماء خیر میں کی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جس حد تک ذاتی اخلاق و عادات کا تعلق ہے ہزار میں دو چار علماء ایسے مل جاتے ہیں جنھیں ہم علماء خیر کی صف میں جگہ دے سکیں، لیکن اگر ذہنی بیداری یا حاسۂ اجتماعی (Common Sense) کے لحاظ سے ان کی تقسیم اعلیٰ و ادنیٰ میں کی جائے تو قسم ادنیٰ میں تو ہمیں ادنیٰ، ادنیٰ تر اور ادنیٰ ترین سبھی درجہ کے نمونے مل جائیں گے، لیکن دوسری طرف قسم اعلیٰ کے خانہ میں بھی انشاء اللہ صفر ہی نظر آئے گا، تدریجی علو کی اور تقسیموں کا کیا ذکر ہے

سرسید مرحوم نے جب انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا تو یہی علماء تھے جنھوں نے مخالفت کرکے پچاس سال پیچھے اپنی قوم کو ہٹا دیا اور جب ملکی آزادی کا سوال پیدا ہوا تو ہمارے یہی علماء کرام تھے جنھوں نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کو ناجایز قرار دیکر سیاسی حیثیت سے ہمیں نیچے گرا دیا، اور اب کہ عام جبری تعلیم کا سوال پیش ہے تو ہمارے یہی مذہبی اجارہ دار اسے شجر ممنوع قرار دیکر مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں

میں یہ سمجھتا تھا کہ اس اسکیم کی مخالفت علماء کی طرف سے ضرور ہوگی لیکن اسی کے ساتھ یہ حسن ظن بھی تھا کہ شاید اونچے درجہ کے مولوی اس میں حصہ نہ لیں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے علامہ سید سلیمان ندوی ایسے حضرات کو بھی اس کی مخالفت پر کمربستہ پایا۔ اچھا تو آیئے ان کے دلایل پر بھی اک نظر ڈال لیں

معارف میں مسلسل تین ماہ سے اس مسئلہ پر شذرے شایع ہو رہے ہیں اور ان سب کا خلاصہ وہ ہے جو اگست کے معارف میں شایع ہوا ہے یعنی یہ کہ "بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ اس سے بچپن ہی میں ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کمانے کا ڈھنگ آجائے گا بلکہ اس لئے کہ اس عمر کی تعلیم کا نقش ان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے قایم رہ جائے گا۔ مسلمانوں کا اس اہم عمر کی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا، عملاً اپنے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہے۔ جس جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظر انداز ہوگا، اس کے معنے یہ ہیں کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں یا یہ کہ مسلمان آیندہ عملاً مسلمان نہیں رہیں گے"

اس اعتراض کو اگر ہم اور زیادہ مختصر کر دیں تو مفہوم یہ قرار پائے گا کہ وارد ھا اسکیم ان کے نزدیک گویا بیدینی کی ترویج ہے

بہرحیف ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے اس اعتراض کا یہ جواب دیدیا ہے کہ "اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی پوری گنجایش رکھی گئی ہے اور اسکول کے اوقات کے علاوہ ہر فرقہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کر سکتا ہے" لیکن سید سلیمان اس سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسکول کے اوقات کے علاوہ جو تعلیم دیجاتی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور علاوہ ازیں وہ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ اس تعلیم کا بار کون اٹھائے گا؟ یعنی ہم کیوں اٹھائیں

ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر، حسب ذیل تنقیحات ہمارے سامنے آتی ہیں :-

۱- کیا وارد ھا اسکیم واقعی اسلام سے ارتداد کی مترادف ہے

۲- کیا اسکول کے اوقات کے علاوہ مذہبی تعلیم خواہ وہ گھر پر ہو یا مدرسہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی

۳- کیا مسلمانوں پر اپنی مذہبی تعلیم کا بار اٹھانا فرض نہیں ہے

تنقیح اول کے سلسلہ میں ارتداد کے لغوی و اصطلاحی معنے کو معرض بحث میں لاکر کوئی منطقی حجت لانا پسند نہیں کرتا اور نہ میں ان سے تسلیم کرا لینا کہ لفظ ارتداد انھوں نے بالکل غلط استعمال کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ اگر وہ کوئی اعتراض کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ وارد ھا اسکیم میں مسلمانوں کو ان کے مذہبی عقاید سے باخبر رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے "مسلمان" کا کیا مفہوم قرار دیا ہے، یعنی انھوں نے اسلام کے عقاید کی پہلے کس سانچہ میں رکھ کر

اعتراض کیا ہے یا اخلاقی و کلچرل پہلو کو سامنے رکھ کر۔ اگر ان کی مراد اس سے صرف "ایمان مجمل و ایمان مفصل" کی تعلیم ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، ہر مسلمان بچہ کو ابتدا ہی میں کلمہ شہادت، کلمہ تمجید اور اسی طرح کے بہت سے کلمات کی تعلیم مل جاتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور ان تمام باتوں کی جو اسلام کے نقطۂ نظر سے ضروری ہوں یا نہ ہوں لیکن مولویوں کے زاویۂ نگاہ سے ضروری ہیں۔ اور اس صورت میں وارد ھا اسکیم پر اعتراض کرنا تحصیل حاصل پر اصرار کرنا ہے۔ لیکن اگر مذہبی تعلیم سے ان کی مراد وہ تمام مذہبی لٹریچر ہے جو ندوۃ العلماء یا دار العلوم دیوبند میں پڑھایا جاتا ہے اور جس کی ترویج و تبلیغ کے لئے ایک جگہ لمبی داڑھی رکھنے کے لئے وظائف مقرر کئے جاتے ہیں اور دوسری جگہ القاسم ایسے خالص مذہبی رسایل کے ذریعہ سے رسول اللہ کی قوت رجولیت کے افسانے بیان کئے جاتے ہیں، تو پھر زیادہ صحیح اعتراض یہ ہونا چاہئے کہ جدید جبریہ تعلیم کا انتظام ندوۃ العلماء اور دیوبند کے سپرد کیوں نہ کر دیا گیا تاکہ سوائے مسلمانوں کے (اور مسلمانوں میں بھی مجھ ایسے نہیں بلکہ خالص سید سلیمان کی قسم کے) کسی اور قوم کا بچہ اس سے مستفید ہی نہ ہو سکتا۔ لیکن اگر مراد اس سے اسلامی کلچر کی تعلیم ہے، سو اسکا تعلق نہ دین اسلام سے ہے اور نہ کسی اٹل قانون معاشرت سے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی جو معاشرت عہد نبوی میں تھی وہ عہد بنی امیہ کی معاشرت سے مختلف تھی اور جو کلچر بنو عباس کا تھا وہ شاہان مغلیہ کا نہ تھا، پھر ہو سکتا ہے کہ جس معاشرت کو آج ہم مسلمانوں کا کلچر کہتے ہیں کل اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ ایک قوم کی تمدنی خصوصیات پر مذہبی تعلیم کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ماحول بھی تمدن کی تشکیل میں برابر کا شریک ہوتا ہے اور اس لئے تمدن و معاشرت کے مسایل کو مذہب میں داخل کرنا یا ان میں کسی تغیر و تبدل کے اندیشہ کو خطرۂ ارتداد سے تعبیر کرنا سخت ناروا جسارت ہے۔ (میں یہاں اس مسئلہ پر گفتگو نہ کروں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کلچر زندہ رہنے والا کلچر نہیں ہے اور اس میں تبدیلی ضروری ہے)۔ اب اگر کوئی اور تیسرا مفہوم مذہب کا ہو سکتا ہے تو براہ کرم سید سلیمان صاحب اسے واضح فرمائیں تاکہ اسکو بھی سامنے رکھ کر ان کے اندیشۂ ارتداد کی حقیقت معلوم کی جائے۔ حیرت ہے اور کسقدر حیرت کہ سید سلیمان صاحب یہ اعتراض تو کر بیٹھے کہ وارد ھا اسکیم میں مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ اسکیم آل انڈیا اسکیم ہے اور صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، اس میں شیعہ، سنی، خارجی، وہابی، قادیانی، معتزلی، اشعری، ہندو، جین، سکھ، زردشتی، عیسائی، یہودی، گبر و ترسا بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کو شامل کیا گیا تو مسلمانوں میں کوئی سرخاب کا پر تو لگا نہیں کہ صرف انھیں کے مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور باقی تمام مذاہب کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس صورت میں ان تعلیم گاہوں کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے مدرسہ کے ایک گوشہ میں مولوی یہ بتا رہا ہوگا کہ گائے کی قربانی میں کئی آدمی شریک ہو سکتے ہیں، دوسری طرف پنڈت سمجھا رہا ہوگا کہ گائے کا مرتبہ ماں کے برابر ہے اور جو اسے ذبح کرتا ہے وہ ظالم و ناپاک ہے۔ ایک طرف بعض بچوں کو یہ بتایا جا رہا ہوگا کہ غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام مطلق ہے، دوسری طرف یہ کہ گوشت جھٹکہ ہی کا کھانا چاہئے، کہیں قرآن پڑھا جا رہا ہوگا، کسی جگہ گیتا، کوئی انجیل کا درس دے رہا ہوگا اور کوئی گرنتھ کا، کسی گوشہ میں تثلیث پر بحث ہو رہی ہوگی اور کسی گوشہ میں وحدانیت پر، کہیں مدح صحابہ کے فضایل بیان ہو رہے ہوں گے اور کہیں تبرا کے ــــ مولانا کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور انسانی خون سے زمین کی پیاس بجھانے میں وہ جس حد تک اپنا فرض ادا کر سکتا تھا، ادا کر چکا ہے۔ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں سبھی اپنے آپ کو الہامی کہتے ہیں

اور سوائے اپنے سب کو گمراہ ۔ دنیا میں ہزاروں بار حق و باطل کی تمیز کے لئے مناظرے اور مجادلے ہوئے لیکن آج تک کوئی مذہب اپنے آپ کو برتر ثابت نہ کر سکا، اس لئے اب ان تجربات کی گنجایش مطلق باقی نہیں ہے اور اس پر اصرار کرنا، انتہائی قصور فہم ہے ۔ اگر ابھی ہندوستان کا جہل اس حد تک دور نہیں ہوا کہ وہ مروجہ مذاہب کو خیرباد کہہ کر محض "انسانیت" و پاکیزگی اخلاق کے مندر دلوں میں تعمیر کر سکے اور مولویوں اور پنڈتوں کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکے، تو سید سلیمان صاحب کو "امن و سکون" کی رعایت اتنی تو ضرور کرنا چاہئے اگر وہ کوئی معقول رائے نہیں دے سکتے تو کم از کم خاموش ہی رہیں

دوسری تنقیح یہ تھی کہ کیا اسکول کے اوقات کے علاوہ مذہبی تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی ۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی نفی اتنی واضح ہے کہ اگر خود سید سلیمان صاحب سے یہ سوال کیا جائے تو وہ گھبرا کر کہہ اٹھیں گے کہ "میرا مطلب یہ تو نہ تھا" دراصل اس کے سوا ان کے اعتراض کا کوئی اور مفہوم ہو ہی نہیں سکتا ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر مذہبی تعلیم نام ہے کسی مخصوص عقیدہ پر قائم کر دینے کا تو اسکی تعلیم گھر کے گہوارہ اور ماں کی آغوش سے شروع ہوتی ہے اور اگر مقصود پیشہ ور مولوی بنانا نہ ہو (جسکی تخلیق اسکول کی حدود سے باہر ہی خوب ہوتی ہے) تو بھی سید سلیمان صاحب مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ علماء سلف میں کتنے ایسے تھے جنھوں نے کسی درسہ میں زانوئے ادب تہ کیا اور کتنے ایسے جن کا فضل و کمال ان کی انفرادی کوشش کا مرہون منت تھا ۔ حیرت ہے کہ ان کے قلم سے یہ بات کیسے نکل گئی کہ "اسکول کے اوقات کے علاوہ جو مذہبی تعلیم دی جائے گی اسکو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوگی"

تیسری تنقیح یہ ہے کہ "کیا اپنی مذہبی تعلیم کا بار اٹھانا مسلمانوں کا فرض نہیں ہے" ۔ کیا میں سید سلیمان صاحب سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جب خود ان کی نگاہ میں بھی مذہب کی اہمیت اتنی نہیں ہے کہ وہ جمعیت اسلامیہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیں تو حکومت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ یہ عذاب مول لے ۔ اگر مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وارد ھا اسکیم پر مسلمانوں کو مرتد بنا دینے کا الزام قایم کیا جا سکتا ہے تو سید سلیمان صاحب بھی اسی جرم کے مجرم قرار دئے جائیں گے، کیونکہ مذہبی تعلیم کے لئے نہ وارد ھا اسکیم روپیہ صرف کرنے کے لئے طیار ہے اور نہ سید سلیمان صاحب

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات قابل غور طلب ہے اور وہ یہ کہ اگر نصاب اور زبان کے لحاظ سے یہ اسکیم کوئی ایسی فضا پیدا کرنے والی ہو جس سے مسلمانوں کے قومی احساس، اجتماعی وقار یا سیاسی وحدت کو صدمہ پہونچ سکتا ہے (اور یہ نفاذ اسکیم سے پہلے نہیں معلوم ہو سکتا) تو بیشک اس کی مخالفت کرنا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ ۔ یعنی محض معارف کے شذرات سے نہیں، بلکہ عمل سے، ایثار و قربانی سے، دار المصنفین کے گوشہ میں بیٹھکر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر اور آستینیں چڑھا کر ۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ وقت کبھی آیا تو "رندانِ قدح خوار" میں سے کوئی نکل آئے تو نکل آئے، اس "فرقۂ زہاد" سے کسی کا اٹھ کھڑا ہونا محال ہے ۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اسوقت شاید معارف کے شذرات میں بھی اس کا ذکر نہ آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ بدقسمتی سے یہ خطرہ اسی وقت پیش آئے جب مولانا مذکور کر بوجہ علالت ڈاکٹروں نے سختی کے ساتھ زبان و قلم کی جنبش سے روک دیا ہو ۔

کیا چین شکست کھا جائے گا؟

چین و جاپان کی جنگ ابھی تو نہیں، لیکن ایک وقت آنے والا ہے جب اس کے نتائج سے نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا کو متاثر ہونا ہے، خواہ کامیابی چین کو ہو یا جاپان کو ۔ اس لئے ضروری ہے کہ قارئین نگار کو

اس کی رفتار سے باخبر رکھا جائے ۔ اس جنگ کے نتیجہ پر حکم لگانے کے لئے واقعات کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ چین و جاپان کی اندرونی سیاسی حالت کیا ہے، دوسرے یہ کہ عسکری تنظیم، جغرافی ماحول اقتصادیات اور بین الاقوامی سیاسیات کے لحاظ سے فریقین کے لئے کیا آسانیاں اور کیا دشواریاں ہیں ۔ اس جنگ پر اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو اُن ماہرین سیاست کا بیان ہے جو محاذ جنگ سے علٰحدہ صرف واقعات و حالات کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں، یا اُن سیاحوں اور اخباری نمایندوں کا جو اس وقت وہاں موجود ہیں اور یہ دونوں اس باب میں متحد الخیال ہیں کہ "چین تو اس جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن جاپان کا ہار مان لینا بھی یقینی ہے" ۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن ہے بالکل صحیح، کیونکہ جاپان کے لئے چین اتنا بڑا لقمہ ہے کہ وہ اسے چبا نہیں سکتا اور لامحالہ ایک نہ ایک دن اسے اُگلنا پڑے گا ۔ اس وقت تک جو حصۂ ملک جاپان نے فتح کیا ہے اسے آپ نقشہ سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف شمالی حصہ ہے اور جنوبی حصہ کی طرف وہ کوئی اقدام نہیں کر سکا ہے ۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ شمالی حصہ میں ریلوں اور دریاؤں کی وجہ سے فوجی نقل و حرکت وہ بہ آسانی کر سکتا ہے اور جنوبی حصہ میں چونکہ یہ آسانیاں نہیں ہیں اس لئے وہ مجبور ہے ۔ جاپان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ چین کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی جائے تاکہ باہر سے اسلحہ وغیرہ کی مدد اسے نہ پہونچ سکے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور نہ آیندہ اسکا امکان ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ہانگ کانگ اور کینٹن کا تعلق اندرون ملک سے قطع کر دے، لیکن اس سے چین بالکل بے دست و پا نہیں بنایا جا سکتا۔ اسکے کئی اسباب ہیں اول تو سامانِ حرب آسانی کے اور متعدد راستے ایسے ہیں جنھیں جاپان بند نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک ہنوئی (فرانسیسی انڈوچائنا) کا راستہ ہے کہ یہاں سے چین کی سرحد تک ریل بھی ہے، سڑکیں بھی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس طرف سے کثیر سامانِ حرب چین کو پہونچ رہا ہے، اس کے علاوہ دوسرا راستہ برما کا ہے، جہاں سے یونانفو تک سڑک طیار ہو گئی ہے اور نہایت آسانی سے چین کو سب کچھ پہونچ سکتا ہے۔ تیسرا راستہ براہ لانچو روس تک پہونچتا ہے، جہاں سے بھری ہوئی لاریاں برابر چین میں آ رہی ہیں اور اسی راستہ سے چین چاء کی بڑی مقدار روس روانہ کر رہا ہے

اب اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ چینی انسان کے مصادف زندگی بہت کم ہیں اور وہ قدرتاً بے انتہا جفاکش و متحمل واقع ہوا ہے اس لئے چین کے لئے مصارف کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو وہ دیوالیہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اسکی کرنسی کے لحاظ سے سونا اس کے پاس بہت کافی مقدار میں موجود ہے ۔ جس وقت ہم چین کے اندرونی جغرافیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سڑکیں بہت کم ہیں اور کوئی راستہ فٹ دو فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں ہے، اس لئے جاپان نہ وہاں بھاری توپخانے پہونچا سکتا ہے، نہ ٹینک ۔ اگر اس کی کوشش بھی کیجائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دھانوں کے کھیت میں وہ دھنس کر رہ جائیں گے اور پھر کوئی صورت ان کے اِدھر سے اُدھر لیجانے کی نہ ہوگی۔ البتہ ہوائی جہاز ضرور جا سکتے ہیں اور ریلوے لائن سے (جو ایک ہی ہے) مشین گنیں بھی پہونچ سکتی ہیں، لیکن جب تک فوج کی کافی تعداد معہ جدید ترین آلات آتش فشاں کے وہاں نہ پہونچے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا ۔ الغرض چین کو مفتوح کرنے کے لئے بجائے توپوں اور ٹینکوں کے انسانوں سے زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جاپان کے پاس اتنی حملہ آور فوج نہیں ہے، جتنے چین کے پاس جان دینے والے انسان موجود ہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت تک چینی سپاہ زیادہ ہلاک ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جاپان نے اپنے ملک سے آکر دوسرے ملک پر حملہ کیا ہے اور چین اپنے ملک کے اندر ہی مدافعت کر رہا ہے اور اس صورت میں اگر دونوں ملکوں کی آبادی برابر ہوتی تو بھی چین کا پلہ بھاری رہتا، چہ جائیکہ جاپان کی آبادی ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے اور چین کی ۴۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ۔

جاپان کا حقیقی مقصود اس حملہ سے چین پر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مغلوب کرکے اپنی تجارت کی منڈی بنانا اور وہاں سے تمام پیداوار حاصل کرنا ہے جس کی جاپان کو سخت ضرورت ہے، لیکن اس مقصود کا پورا ہونا آسان نہیں، کیونکہ اول تو چینیوں کے وطن پرستانہ جذبات اب بہت قوی ہوگئے ہیں اور وہ کبھی جاپانی مال استعمال نہیں کریں گے، علاوہ اس کے اسوقت جاپان جو کچھ جنگ میں صرف کر رہا ہے وہ اندازہ سے زیادہ ہے کہ عرصہ تک وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ جاپان اسوقت ۵۰ لاکھ جاپانی ڈالر یعنی تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ روزانہ صرف کر رہا ہے اور اس وقت تک ۲ ارب ڈالر (یا چھ ارب روپیہ) خرچ ہوچکا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک اس صرف خطیر کو برداشت کرنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی نتیجہ کیا ہوگا۔ جاپان میں اسوقت ٹیکسوں کی بھرمار ہے اور اس کے مال کی برآمد ۲۰ فیصدی گھٹ گئی ہے

خود جاپان اس لڑائی کی اُلجھنوں کو جس نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہے اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ وہاں کے تمام لیڈر لوگوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کو اس جنگ سے جلد اختتام کی توقع نہ رکھنا چاہئے، لیکن اور ملکوں کے ماہرین جنگ سوچ رہے ہیں کہ آیا جاپان اس غیر معمولی بار کو دو تین سال تک برداشت کرسکتا ہے یا نہیں، اور چونکہ چینیوں کو بھی اس کا علم ہے کہ جاپان زیادہ عرصہ تک اس بوجھ کو سہار نہیں سکتا اس لئے وہ بھی اڑے ہوئے پر طیار ہوگئے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ جنگ جتنی زیادہ طوالت پڑے گی ان کا اتنا ہی زیادہ فایدہ ہے

اب جنگی نقطۂ نظر سے ہٹ کر انتظامی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب تک وہ چین کے اس جذبۂ مقاومت کو نہ توڑے وہ کسی مفتوحہ علاقہ پر قابض نہیں رہ سکتا، یعنی اگر وہ کوئی حصۂ ملک حاصل کرے تو بھی اسے قبضہ میں رکھنے کے لئے کم از کم ۲۰ لاکھ سپاہ رکھنے کی ضرورت ہوگی، اور اس کے بعد بھی یقین نہیں کہ چینی لوگ جاپانیوں کے ساتھ ان کی مرضی کے مطابق معاملۂ تجارت کرنے پر راضی ہوجائیں گے

اب اسی کے ساتھ آپ جاپان کی اندرونی حالت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی امید افزا نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چین اندرونی اختلافات کا شکار ہے، یہ درست ہے، لیکن جاپان بھی ان اندرونی اختلافات سے پاک نہیں ہے۔ وہاں اس وقت دو جماعتیں ہیں، ایک عسکری اور دوسری مدبرین سیاست کی اور ان دونوں میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے وہاں عسکری جماعت ہی برسر اقتدار ہے لیکن ملک کی عام آبادی اس کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتی اور دوسری جماعت کا کسی نہ کسی وقت برسر اقتدار ہوجانا یقینی ہے، کیونکہ چیزوں کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور کاروبار کی خرابی کی وجہ سے وہاں کا متوسط طبقہ بہت برہم ہے

پھر علاوہ ان دو جماعتوں کے اختلاف کے لطف یہ ہے کہ خود عسکری جماعت کے اندر دو گروہ پائے جاتے ہیں، چنانچہ وہاں کی بری اور بحری فوج کی مخالفت مشہور چیز ہے۔ شنگھائی کی بربادی کا سبب صرف یہی تھا کہ جاپان کی بری فوج منچوریا میں کامیابی حاصل کرچکی تھی اور اسے مقابلہ میں بحری فوج کو بھی اپنا کارنامہ دکھانا ضروری تھا۔ بظاہر یہ جذبۂ مسابقت قابل نیک معلوم ہوتا ہے، لیکن جسوقت اقتصادی دشواریاں بڑھ جائیں گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دونوں فوجیں خود دست و گریباں ہوجائیں گی اور جاپان نہایت ہی ہولناک قسم کے انقلاب کا شکار ہوجائے گا

اب اس کے مقابلہ میں چین کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد وہاں اتنا اتحاد کبھی نہیں پایا گیا جتنا اسوقت پایا جاتا ہے سیاسی جماعتوں کا اختلاف وہاں اب بھی پایا جاتا ہے اور اگر جاپان نے جنگ نہ چھیڑ دی ہوتی تو یہ اختلاف بدستور تباہیاں پھیلاتا رہتا لیکن اب ایک مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے انھوں نے اپنے اندرونی اختلافات کو ملتوی کردیا ہے

چین میں ایک جماعت اشتراکیوں کی ہے جن کا سردار مارشل شنگ کا شیگ ہے اور دوسری جماعت ملوکیت پسندوں کی ہے جس کا سردار اسوقت جنرل پائی زنگ ہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اشتراکیوں کو نہایت ہی نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، لیکن اسوقت دونوں جماعتیں ایک ہوگئی ہیں اور مارشل شنگ کا شیگ نے اپنی سترہ ڈویزنوں اور جنرل پائی زنگ ہی کی افواج کو ایک دوسرے سے بالکل متحد کر دیا ہے

اب اسباب جنگ کی فراہمی اور تربیت افواج کے مسئلہ کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سامان حرب مل بھی جائے تو غیر تربیت یافتہ فوج اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اسپین کی موجودہ جنگ کی ابتدا میں یہی ہوا کہ بہت سے ہوائی جہاز غیر ماہر انجینروں کی وجہ سے تباہ ہوگئے چین کے پاس غیر ملکی ماہرین فن موجود ہیں لیکن کم، اور پھر یہ کہ وہ بہت زیادہ ہوشیار بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روسی ہوا باز چین میں زیادہ کام کر رہے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور اگر ہوں بھی تو وہ اس لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتے کہ وہ زیادہ خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ جرمن ماہرین فن وہاں زیادہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ نہایت ہوشیار ہیں۔ اول اول جب نین کنگ پر جاپان نے حملہ کیا تو چینی جنرلوں نے ان کے مشوروں کو نہیں مانا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین کو شکست کھانا پڑی، لیکن اب جرمن افسران کا اثر بڑھتا جاتا ہے — جب ۲۰ فروری کو ہر ہٹلر نے مینچکو پر جاپان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تو یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ شاید جرمن افسران واپس بلائے جائیں گے، لیکن اول تو ابھی تک کوئی کارروائی ایسی ہوئی نہیں اور اگر ہو بھی تو خیال یہی ہے کہ یہ واپس نہ جائیں گے کیونکہ وہ چین کی کامیابی کے لئے بہت کوشاں ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ چین کے پاس نہ ویسے آلات حرب موجود ہیں جیسے جاپان کے پاس ہیں اور نہ فوج اتنی تربیت یافتہ ہے تاہم اسکی تلافی تعداد سپاہ اور اندرون ملک کے ان دشوار گزار راستوں سے ہو سکتی ہے جہاں جاپان اپنے جدید اسلحہ سے کام نہیں لے سکتا۔ علاوہ اس کے چین کو سب سے زیادہ اعتماد اپنی غیر آئینی (گوریلا)[1] قسم کی جنگ پر ہے۔ ہر چند اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ چین کی عسکری مرکزیت بکھر کر منزلزل ہو جائے گی اور جنگ ختم ہونے پر ان جماعتوں کو سنبھالنا دشوار ہو جائے گا لیکن اس وقت جاپان کا اقدام و تسلط ضرور رک جائے گا — یہ ہے چین و جاپان کی موجودہ حالت اور یہ ہے وہ صحیح پوزیشن جس کو دیکھ کر ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ چین کی کامیابی تو جاپان کے مقابلہ میں ممکن نہیں، لیکن جاپان بھی فایدہ میں نہیں رہ سکتا اور جس مقصد کو لیکر وہ اٹھا ہے وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

حال ہی میں روس اور جاپان کے درمیان جو سرحدی نزاع ہوگئی تھی اس سے چین کی توقعات بہت بلند ہوگئی تھیں، کیونکہ جاپانی اقدامات چین کی طرف رک گئے تھے، لیکن اس نزاع کے ختم ہو جانے پر پھر وہی صورت عود کر آئی ہے جو پہلے پائی جاتی تھی۔ دریائے زرد کے سیلاب اور ہیضہ وغیرہ کی وجہ سے گو جاپانی فوجوں کو کافی نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے، لیکن یہ فطری موانع ایسے نہیں جو انسانی عزایم کو پست کر سکیں۔ جاپان تو اسوقت جوا کھیل رہا ہے اور اس نے داؤ پر اپنا سب کچھ لگا دیا ہے۔ اگر اس کو کامیابی ہوگئی تو پھر یہ یقینی ہے کہ ایشیا میں مغربی اقوام کا زور بالکل گھٹ جائے گا، اور کم از کم ۵۰ سال کے لئے پھر اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں مل سکتی — مغربی ممالک یہ تو یقیناً نہیں چاہتے کہ چین پامال کر دیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ جاپان جنگ ختم کر دے، کیونکہ وہ تو بہرحال اس کے زور و طغیان کو توڑنا چاہتے ہیں، اور اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ جنگ کے غیر معمولی و صارف سے اس کی اقتصادی حالت کو تباہ کر دیا جائے اور تجارتی منڈیوں کو اس کے مصنوعات سے خالی

---

[1] (سپانش گوریلا) ہسپانوی زبان سے آیا ہے۔ اس سے مراد وہ بے قاعدہ جنگ ہے جس میں عسکری جماعتیں دشمن پر حملہ کرتی ہیں سنہ ۱۸۰۸ء میں ہسپانیوں نے فرانسیسیوں کے خلاف اسی طریق سے جنگ کی تھی اور اسی وقت سے یہ لفظ اس معنے میں رائج ہوگیا۔

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری

(۲)

کلیات آپ نے سولہ ہزار اشعار فارسی زبان میں کہے ہیں۔ بارہ قصائد و قطعات اور مختصر سے مرثیہ کے علاوہ باقی سب غزلیں ہیں۔ کلیات نسبتی کے زیر نظر نسخہ میں قصائد وغیرہ کے اشعار کی تعداد چار سو اڑسٹھ اور غزلوں کے شعروں کی پندرہ ہزار پانسو ترانوے ہے۔ چند غزلیں دو بار لکھی ہوئی ہیں۔ ان مکرر اشعار کی تعداد ساٹھ اشعار کے قریب ہوگی

رباعی کے مقررہ اوزان میں چار شعروں کی ایک غزل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مجموعۂ سخن میں کوئی رباعی نہیں۔ کلمات الشعراء اور روز روشن کے قول کے مطابق فارسی کے علاوہ ہندی (بھاکا) میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور "نسبتی" جس کے معنی محمد افضل سرخوش نے "چاند" لکھے ہیں تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا ہندی کلام بالکل نہیں ملتا۔ فارسی کلیات بھی خان آرزو المتوفی ۱۱۶۹ھ کے عہد کے بعد گم ہو گیا تھا۔ علاوہ اس نسخہ کے جو مجھے دستیاب ہوا ہے۔ "دیوان نسبتی" کے دو مختصر سے انتخابات اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں ـــ ایک نمبر ۳۱۸ ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

ور زلزلہ آوردۂ از ناز زمیں را / یک رہ سر پائے مزن ایں خاک نشیں را

دوسرے نسخہ میں یہ شعر پروھویں غزل کا مطلع ہے:۔

مہت گفتم برخ پردہ فگندی / مرا از روئے خود شرمندہ کردی

میرے نسخہ میں یہ شعر آخری غزل سے پہلی غزل کا تیسرا شعر ہے

اس نسخہ پر تاریخ تحریر درج نہیں۔ مولوی عبدالمقتدر صاحب کے خیال میں یہ نسخہ اٹھارویں صدی عیسوی کا ہے۔

دوسرے نسخہ کا نمبر ۳۱۹ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ مختصر ہے۔ یہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

بکوئے یار بنا کردہ اند خانۂ ما / بہ شاخ زلف نہادند آشیانۂ ما

اس میں ۲۸ رباعیاں بھی پائی جاتی ہیں، پہلی رباعی یہ ہے ؎

از آنچہ روست اختلافِ دُنیا / لافِ دنیا بما۔ گزافِ دُنیا

ایں ہر دو مخالفت بمن آید راست / دنیا بخلاف ما و ما خلافِ دُنیا

میرے پاس جو کلیات ہے اُس میں بجز چار اشعار کے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں کوئی رباعی موجود نہیں، وہ چار شعر یہ ہیں :-

از جور من شکستہ خاطر شادم — بشکن بشکن کہ دل بدستت دادم
زاداست ہماں روز بلا ہم یارب — زاں روز سیہ کہ من زمادر زادم
از من غلط اوفتاد اورا چہ کند — جاں می طلبید یار۔ من دل دادم
اے اشک مبادا کہ برد سیل مرا — اے آہ مبادا کہ دہی بر بادم

میں نہیں کہہ سکتا کہ پٹنہ لائبریری کے یہ انتخابات کن نسخوں سے کئے گئے ہیں۔ میرے نسخہ میں نسبتی کے جتنے مشہور اشعار ہیں۔ سب موجود ہیں اور دیوان کے ابیات کی تعداد بھی بالکل وہی ہے جو مشہور ہے۔ کاغذ کی رنگت اور کتابت بھی نسخہ کی قدامت پر دال ہے۔ مگر صحیح تاریخ تحریر کا علم دشوار ہے، کیونکہ نہ کاتب کا نام درج ہے نہ تاریخ نقل و تحریر البتہ کہیں کہیں حواشی پر کاتب نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ نسخہ اصل نسخہ کی بعینہٖ نقل ہے۔ کاتب کسی کسی مقام پر پڑھ نہیں سکا۔ اس لئے وہ جگہیں اس نے خالی چھوڑ دی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں زیر نظر نسخہ تمام معلومہ نسخوں میں سب سے زیادہ مکمل ہے خواہ آزرد نے دیوان نسبتی کا ایک انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں "میں نے آج سے بیس برس پہلے اسکے دیوان سے تین ہزار اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ جو شاہ مبارک آبرو (میرا شاگرد تھا اور قرابت قریبہ بھی رکھتا تھا) لے گیا اس کی وفات کی وجہ سے وہ کاغذات مجھے نہ مل سکے۔ میں ان کی گم شدگی پر کف افسوس ملتا تھا۔ اتفاقاً پندرہ برس کے بعد شیخ مبارک محی الدین کی سعی سے جو اس تذکرہ (مجمع النفائس) کی تصنیف کے محرک اصلی ہیں، وہی کھویا ہوا انتخاب دستیاب ہو گیا"۔ مختلف تذکروں میں ان کے سو۔ دو سو اشعار ملتے ہیں بجز ان کے اور کوئی نسخہ کلیات نسبتی کا کہیں موجود نہیں انڈیا آفس اور بوڈلین لائبریری کی فہرستیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں میری نظر سے گزری ہیں —— ان میں بھی دیوان نسبتی موجود نہیں۔ علامہ شیرانی اور علامہ شبلی کے کتب خانے بھی اس سے خالی نظر آتے ہیں۔ مجھے جو نسخہ کلیات نسبتی کا ملا ہے وہ مولوی صاحب کھنڈ کے کتب خانہ کا ہے

کلام پر تبصرہ اگرچہ نسبتی کا کلام دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گیا، مگر آپ کا نام شاعری کے حلقوں میں برابر گونجا کیا اور جب کبھی ہندوستان نے ایران کے مقابلہ میں اپنے فارسی گو شعرا پیش کئے تو نسبتی کا نام بھی ان میں ہوتا تھا۔ چنانچہ صائب شاہ عباس صفوی کے دربار کا ملک الشعراء، نسبتی کے سحر کلام کا قایل تھا۔[1] ذیل میں چند اکابر ادب و اساطین شعر کی رائیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اسلاف کا ان کی شاعری کے متعلق کیا خیال تھا

---

[1] گزشتہ اشاعت میں صائب کی رائے اور اُس پر علامہ شیرانی کی رائے گزر چکی ہے

اور علماء حال کس نظر سے دیکھتے ہیں:۔

۱۔ "اشعارش نہایت گداختہ۔ پختہ و خوش قماش واقع شدہ" مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی)

۲۔ "ان کا ہر شعر پر معانی ہوتا ہے، یہ شعر ادبی حلقوں میں بہت مشہور رہے:۔

نسبتی دل بدرد معتبر است ٭ لالہ با داغ آبرو دارد۔ کلمات الشعراء (محمد افضل سرخوش)

۳۔ در شاعری خداوند علو کلام۔ اکثر گفتوہائے عشق دارد و سراپا در دار کلام او می بارد۔ گل رعنا (شفیق اورنگ آبادی)

۴۔ نسبتی تھانیسری شاعر خوش خیال است۔ سفینۂ بے خبر (میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی)

۵۔ بندہ آرزو معتقد سخن اوست۔ خیلے بدرد و مزہ حرف می زند۔ مجمع النفائس (سراج الدین علی خاں آرزو)

۶۔ طبعے باسوز و گداز داشت کہ اثرش از اشعارش تراوش می کند، ہنگام خواندن اشعار اشک از چشم او می تراوید۔
روز روشن (منشی محمد حسین صبا)

۷۔ کہتے ہیں نسبتی ہمہ تن درد ہے۔ شعر پڑھتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے۔ عمل صالح (محمد صالح کنبوہ)

۸۔ ملک الشعراء میرزا رفیع سودا نے انھیں فارسی کے اکابر شعراء میں شمار کیا ہے

۹۔ مرزا صائب کی رائے گزر چکی ہے

۱۰۔ مولانا نسبتی کا کلام تذکرہ میں پڑھا ہے۔ کلام پختہ ہے۔ کہیں کہیں تشبیہیں بھی نادر ہیں (سید سلیمان ندوی)

۱۱۔ نسبتی بے مثل کہنے والے تھے (مولانا نیاز مدیر نگار)

ادب و شعر کے نقاد، نسبتی کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں۔ مجملاً عرض کر چکا ہوں اب ان کے کلام سے مثالیں پیش کر کے میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ نسبتی کیا[1] تھے! کسی نے کہا ہے کہ شاعری دل کا معاملہ ہے۔ حساس طبیعتیں جب

---

[1] رفع التباس کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا نسبتی واسطی تھانیسری کے علاوہ ایک اور شاعر بھی یہ تخلص کیا کرتا تھا، وہ مشہد کا رہنے والا اور شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ کا مشہور شاعر ہے۔ بہت عرصہ آذربائیجان میں رہا۔ آخر الامر شاہ مذکور کے عہد حکومت میں دار الارشاد اردبیل میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوا۔ (آتش کدۂ آذر اصفہانی)

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

غائب ز دیدہ ناشدہ جاں داد نسبتی، بے چارہ تاب ہجر ازیں بیشتر نداشت

می نگری زماں زماں روز وصال کے من تا شب ہجر سوزدم حسرت ہر نگاہ تو

بوسیم گر کم آئم بر دلم نبود غبار از تو کہ از آمد شد بسیار گشتم شرمسار از تو

(منقول از آتش کدۂ آذر اصفہانی)

در اول بے وفا نسبتمت در زبان حسرت چہ می کردم اگر دل می نہادم بر وفائے تو

سے رفت و عالمے نگرانش ز بے کسی آنکہ دل فرد و کرتاب نظر نداشت

(منقول از خزانۂ جواہر نیز از مظہر)

دردمندے کہ با امید وفائے تو بود صبر او کاش بمقدار جفائے تو بود

نسبتی سادہ چرا می نشدی عاصی عہ شوق اضطراب ش بے کفن نہ برائے تو بود

(منقول از مجمع النفائس۔ خان آرزو)

اپنے واردات قلب بیان کرنے پر آتی ہیں تو سننے والوں کو جگر تھام لینا پڑتا ہے۔ نسبتی چونکہ ایک آزاد منش صوفی تھے اسلئے انھوں نے زیادہ تر غزلیں ہی لکھیں۔ یا یوں کہئے کہ آنسوؤں۔ آہوں۔ نالوں۔ دل کے ٹکڑوں اور جگر پاروں کا ایک انبار ہے۔ جس کا نام دیوان نسبتی ہے۔ قصائد ہیں تو وہ بھی اس والہانہ محبت کا نتیجہ ہیں جو انھیں دادِ رسول اور زوج بتول سے تھی۔ مدحیہ شاعری کو وہ ننگِ انسانیت سمجھتے تھے

چرا مدح کردند مخلوق را　　بہ ننگم ز خاقانی و انوری ؎

تذکرہ نویسوں کا متفق اللفظ ہو کر کہنا کہ عشق ان کے کلام سے ٹپکتا ہے اور درد ان کے اشعار سے برستا ہے۔ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں اور کتنا صحیح لکھتے ہیں ؎

جز شعر تو نسبتی ندیدیم　　خونِ جگرے بایں روانی

نسبتی کا اندازِ سخن وہی ہے جو کلیم۔ صائب۔ غنی اور سلیم کا ہے۔ مگر یہ ساتھ ہی ساتھ متقدمین کی سادگی کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان کے سیکڑوں اشعار پڑھ جائیے ایک لفظ ایسا نہ ملے گا جس کے لئے لغت دیکھنے کی ضرورت پڑے۔ کلیم کا ہم سخن کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ مضمون آفرینی اور خیال بندی میں یہ بھی اسی فضا میں اڑتے ہیں۔ بلکہ جب تک خیال بندی حسن تعلیل کی حد سے نہیں نکلتی، نسبتی اس کے ہمدوش رہتے ہیں اور مثالیہ میں تو یہ یقیناً کلیم کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

علامہ شبلی شعر العجم جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے، امیر خسرو کا ایک مشہور قصیدہ سرتاپا اسی صنعت میں ہے۔ لیکن کلیم۔ صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنا دیا۔ چونکہ یہ تینوں شاعر کشمیر میں مدت تک ہمدم و ہم قلم رہے تھے، اور باہم مشاعرے رہتے تھے۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولاں گاہ بنا دیا"

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نسبتی کو ظفر خاں احسن سے یک گونہ تعلق تھا اور وہ اس تعلق کی بنا پر کبھی کبھی کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے ان کی شاعری پر کشمیر کے اس قیام گاہ گاہی کا اثر ہوا ہو اور صائب کی ملاقات اور دوستی ہمند طبع پر تازیانہ ہوئی ہو، گو نسبتی طبعاً حافظ شیراز کے رنگ کو پسند کرتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

من نسبتیم معتقدِ حافظِ شیراز　　در فارسیم ہیں کہ ہمہ فرس طراز است

راہِ زمینِ حافظِ شیراز رفتہ ایم　　تا ہمتش بہ فیضِ سخن راہبر شود

اور حسن دہلوی کے بھی معتقد تھے ؎

احسن احسن زہے سخن پرداز　　حسنِ ہند سعدی شیراز

مگر ماحول سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ علامہ ایک جگہ شعر العجم میں رقمطراز ہیں کہ "مثالیہ یعنی کوئی دعویٰ کرنا اور اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرنا۔ یہ طرز نہایت مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ شاعری کے خاتمہ تک قایم رہا"

یہی وجہ ہے کہ اگر نسبتی اپنے سوز دروں، کی وجہ سے سعدی۔ حسن دہلوی اور حافظ کے معتقد تھے وہاں صائب کے مثالیہ کے بھی شیدا تھے۔ مثالیہ شاعری بظاہر ایک قسم کا تصنع و آورد ہے۔ بسا اوقات یہ بھپتی کی حد سے نہیں بڑھتی۔ لطیف تغزل ایسی بھپتی کب برداشت کر سکتا ہے۔ مگر مثالیہ کی اثر آفرینی کی اسوقت کوئی حد نہیں رہتی، جب وہ حسب حال ہونے کے علاوہ بے ساختہ معلوم دے مثلاً

نسبتی دل بدرد معتبر است ــــــ لالہ با داغ آبرو دارد،
دل بدرد آمد مرا در بزم وصلش نسبتی ــــــ در بہاراں تازہ می گردد جنون دیوانہ را
شدم از خاطر آں مست بدر خو، ــــــ چو حریفِ حالتِ مستی فراموش
چوں ناوکے کہ در جگر صید می خلد ــــــ در دل ہمی خلد نگہِ نا تمام او،
رواں شد محمل لیلیٰ و مجنوں با دلِ سوزاں ــــــ جُدا از کارواں اُفتادہ چوں از کارواں آتش
مانندِ غریقے کہ بجاں شاک زند دست ــــــ چسپیدہ بداماں مژۂ چشمِ ترِ ما
از دیدنِ تو دیدۂ من سیر نگردد ــــــ کس پُر نتواند کہ کند چشم گدا را

مثالیہ کی دُھن میں تغزل کی لطافت ہاتھ سے جانے نہ دینا نسبتی کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز بنا دیتا ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہی ہے جو سعدی کے ذکر میں علامہ شبلی نے تحریر فرمائی ہے "شیخ میں یہ جذبہ (عشق) فطری تھا۔ اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیاوی تعلقات سے آزاد رہا۔ اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی۔ اسی آگ کے شعلے ہیں جو اس کی زبان سے نکلتے ہیں"۔ سعدی کو دنیا داروں سے تعلق رکھنا پڑتا تھا اور وہ ان کی طرف سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے جیسا کہ ان کی زندگی کے واقعات ثابت کرتے ہیں۔ مگر نسبتی ان سب باتوں سے پاک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آتشِ شوق کا التہاب کم اور اُن کا کلام سراپا سوز بن گیا۔ مثلاً

ایں عشقِ بے قرار و ایں صبر بے تحمل ــــــ فرصت نداد یکدم از ترکتاز ما را
ہست از آشنائی تو بمن، ــــــ ایں کہ بیگانگی است خویشاں را
آشنا می شوی و می ترسم ــــــ آشنائی شود بلا نشود،
رہے است راہِ محبت کہ غیر دل نزدد ــــــ بیا و سر نتواں کرد جستجوئے ترا
شوق گو دود دم برآر و عشق گو جانم بسوز ــــــ نیست غم در خانہ گر آتش فتد پروانہ را
جانِ ازاں پیش ما عزیز تر است ــــــ کہ بجانہا سر لیت جانان را
می کنم سخت یادِ او امروز، ــــــ غالباً یاد کردہ است مرا
تفرقۂ ہجر و وصل لازمۂ عاقلی است ــــــ ہست یکے روز و شب عاشقِ دیوانہ را

سخت می ترسم کہ من لبسیار می خواہم ترا — آرزو خوبست اما ایں قدر ہا خوب نیست

مرا اندوہِ دل - دلگیر کردہ است — در آغازِ جوانی پیر کردہ است

نسبتی می رود زحال بحال، — باز بر حالِ خویش می آید

بر خاک فگندم دل و ہم خواہش دل را — دیوانہ چو شوریدہ باسباب نسازد

حسرتِ بے حسرتی از غم مرا سازد ہلاک — حسرتِ او یک نفس گر از دلم بیروں شود

دور آخر گشت و ساقی رفت و مجلس برشکست — من ہمال خونم کہ در مینائے خود ہستم ہنوز

دیدیم عاقبت کہ ہمیں داغ بود گل — عمرِ عبث تلف شدہ در انتظار گل

گفتی احوال بگو - حال دگرگونم شد — حال ایں است کہ از حال بحالے شدہ ام

علوم دردِ باد در اوراقِ لالہ درج شدہ است — زعلمِ داغ ہمیں یک رسالہ می بینم،

شرح و بیانِ داغ در اوراقِ لالہ نیست — اے دل بجاں مطالعۂ ایں رسالہ کن،

خبر ز خاکِ شہیدِ تو باد ہم نگرفت — خوشا غبار کہ بادے بگیرد ش خبرے

شعر اسی قدر لطیف اور پُرزور ہوتا ہے، جتنی تشبیہات نادر و لطیف ہوں۔ نسبتی کے کلام کا اس زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو تحفۂ گلزار سامنے آجاتا ہے:۔

بے روئے تو بیمار شد از بسکہ نگاہم — از جا بعصائے مژہ خیز و نظرِ ما

مژہ کو نظر کا عصا کہنا تشبیہ و محاکات کا نہایت پاکیزہ امتزاج ہے

چشمِ مخمورت زند بر دل چو زخم تازہ را — زخمہائے کہنہ لب وا می کند خمیازہ را

زخم کو خمیازہ کہنا کتنا پیارہ انداز بیان ہے

مانندِ غریقے کہ بجا شاخ زند دست — چسپیدہ بداماں - مژۂ چشمِ ترِ ما

قاآنی کا یہ شعر ہے

دو زلفِ تابدار او بچشمِ اشکبارِ من — چو چشمۂ کہ اندروشنا کنند مارہا

مرکب تشبیہ کا لاجواب نمونہ کہا جاتا ہے۔ مگر قاآنی سے بہت پہلے نسبتی یوں فرماتے ہیں:۔

وقتِ گریہ یادِ رویش می کنم — خام کارم نقش می بندم بر آب

قاآنی نے پانی میں سانپ لہرائے اور نسبتی نے تصویر کھینچی "نقش بر آب بستن" محاورہ بھی ہے اور عاشق کی سعیِ لاحاصل کی حسرتناک تصویر بھی۔ جب آدمی نئی نئی محبت کرتا ہے تو اس کی نظر میں حسنِ یار کی کشش بھی ہوتی ہے اور خطرات کا اندیشہ بھی۔ اس تذبذب و پس و پیش کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

دلم ہمی رود و باز پس ہمی نگرد — چگونہ راہِ بیاباں رود کہ نو سفر است

محبوب کے چلے جانے کے بعد دل میں جو خلش سی پیدا ہوتی ہے اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں

تو رفتی خار خارے ہست در دل — گزشتہ موسمِ گل ۔ خار باقی است

تشبیہ شاعری کی جان ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ عامۃ الورود واقعات پر اسکی بنیاد قایم ہو۔ اس رنگ کا شعر ملاحظہ ہو۔

می رود بے تو بزیرِ مژہا جوئے سرشک — سایۂ بید بر آں آب روان است ہنوز

جس نے کسی دریا کے کنارے بید کے سایہ کو متحرک دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ نسبتی نے مصرعہ اول پیدا کرنے میں کیا کمال دکھایا ہے۔ راز کے جلد تر افشا ہو جانے کو یوں کہنا کہ آدھی رات کے وقت سورج طلوع کر آیا۔ ندرتِ بیان اور پاکیزگیٔ تشبیہ کی لاجواب مثال ہے ؎

رازِ ما زد در روئے روز افتاد — نیم شب ۔ صبح شد ۔ بخانۂ ما

ذوق مرحوم کا ایک شعر ہے جو سادگی جوشِ اثر و واقعیت کی بہترین مثال ہے

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ — جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

نسبتی کا بھی یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

چوں دو ہمدرد کہ گریند بہم از ہر دل — می کند دیدہ جدا گریہ ۔ دلِ زارِ جدا

میر تقی میر کا شعر ہے :۔

زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند — بہت تڑپا کیا ۔ جوں مرغِ پر بند

نسبتی بہت عرصہ قبل اس مضمون کو یوں ادا کر چکے ہیں

نسبتی مکتوب را مادر زمیں افگندہ ایم — ہمچو مرغِ نیم بسمل خود بخود پر می زند

کسی مضمون کو جوں کا توں لے لینا سرقہ کہلاتا ہے لیکن اگر مضمون میں کوئی ترقی پیدا کی جائے تو معیوب نہیں یہی حال ترجمہ کا ہے۔ کسی مضمون کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اسی وقت جایز ہو سکتا ہے۔ جب اصل خیال کا حُسن قایم رہے۔ مثلاً نظیری نیشاپوری کا شعر ہے ؎

بوئے یارِ من ازیں سمت وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا نے اس کو اُردو میں منتقل کیا اور زیادہ حسن کے ساتھ

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

خاقانی کا ایک شعر ہے :۔

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت — خاقانی را دگر شب آمد

اُردو میں یہ شعر اس طرح منتقل ہوا کہ اصل اور نقل کا امتیاز اُٹھ گیا

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج بھی رات سو چکے ہم

میر نے اس مضمون کو یوں لیا

یونہی میر گر رات روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

حاجی جان محمد قدسی عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر کہتا ہے:۔

زود بہ کردم من بے صبر داغ حویش را — اول شب می کشد مفلس چراغ خویش را

یہی خیال میر نے اُردو میں ادا کیا اور زیادہ حسن کے ساتھ

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ہاں تو میں نسبتی اور میر کے اشعار کا تقابل دکھا رہا تھا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا ایک شعر ہے جس کا اس مضمون سے تو کوئی تعلق نہیں مگر اس کے خیال کی بنیاد یہی نسبتی کا "مکتوب بر زمیں اُفتادہ" معلوم ہوتی۔ اس لئے وہ بھی سُن لیجیے:۔

مرے سینہ میں دل بے تابیوں سے — پھڑکتا ہے مثالِ مرغِ پر بند

عاشق مے کشی میں مصروف ہے، لیکن چونکہ معشوق شریک نہیں۔ اس لئے وہ مصروفِ نالہ بھی ہے۔ معشوق کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ نالۂ عاشق کو پیالہ کی "کھنک" کہتا ہے۔ وجہ شبہ وہی آواز ہے ؎

پیالہ می خورم و دل بنالہ می آید — ترا گماں کہ صدا از پیالہ می آید

معاملہ بندی عشق و ہوسناکی کے واقعات اہلِ لکھنؤ کی زبان میں معاملہ بندی کہلاتے ہیں۔ فارسی میں معاملہ بندی کے موجد شیخ سعدی مانے جاتے ہیں۔ امیر خسرو نے اس میں نمایاں اضافہ کیا۔ مرزا اشرف جہاں قزوینی۔ ولی دشت بیاضی۔ وحشی یزدی نے اس کو مستقل فن بنا دیا۔ (شعر العجم) نسبتی نے بھی اس فن میں بساط بھر خوب داد دی سعدی کا مشہور شعر ہے:۔

دوستاں منع کنندم چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

امیر خسرو نے ایک جدید اسلوب پیدا کر کے یہی مضمون باندھا

جراحتِ جگر خستگاں چہ می پرسی — ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

نسبتی کے تیور ملاحظہ کیجیے:۔

نسبتی را ملامتے مکنید — ناصحاں روئے یار را نگرید

رئیس المتغزلین نظیری نیشاپوری نے کہا تھا۔

تا منفعل ز بخشش بیجا نہ بنیمش — می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت

محفل جمی ہے، معشوق کی دزدیدہ نظری رقیب پر پڑ رہی ہے۔ دفعتاً عاشق کی نظر بھی معشوق کی طرف اٹھتی ہے۔ وہ اس حال سے آگاہ ہو کر گھبرا سا جاتا ہے لیکن فوراً سنبھل کر عاشق کو بری نظروں سے دیکھنے لگتا ہے عاشق نادم ہوتا ہے، اور رقیب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اس منظر کی تصویر نسبتی نے جس خوبی سے کھینچی ہے اس کی مثالیں شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ لکھتے ہیں

سوئے اغیار ہمی دید۔ نہانے دیدم من خجل گشتم و اغیار خجل۔ یار خجل

ناکام عاشق جانتا ہے کہ محبوب کا اس کے یہاں آنا محال ہے، لیکن پھر بھی وہ جھوٹی باتوں سے دل کو تسلی دیتا رہتا ہے، اس کیفیت کو نسبتی یوں بیان کرتے ہیں:۔

دروغے می کنم درکار و می گویم کہ یار آمد نمی دانم کہ تا کے ایں روش دل را بجا دارم

دوسرے مصرعہ سے سوز و گداز کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، اس کا جواب نہیں۔ آدمی عالم تنہائی میں محبوب کی غیبت میں سیکڑوں منصوبے باندھتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ اب کے ملاقات ہونے پر یہ کہوں گا، یوں کہوں گا، مگر سامنا ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر وہ سوچتا ہے کہ یہ کیا بات تھی، مجھ سے کیوں نہ کچھ کہا گیا، رعب حسن تھا۔ سحر کلام تھا۔ کیا تھا۔ نسبتی اس کو یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

ہیچ بتوانی تو ای گفت کہ ایں چہ حکمت است لب بہ سخن چو وا کنی بستہ شود زبان من

اسی رنگ و مضمون کے اشعار چند اور ملاحظہ ہوں:۔

می پرسی و ما دلشدگاں نطق نداریم ایں چیست کہ از کار فتادہ است زبانہا

پرسید کہ چونی و نگفتم کہ چیائم امروز زباں سخت ز تقریر فتادہ است

می رسی و خشک می گردد زبانِ گفتگو می روی و می ترا دد از لبم گفتار ہا

رہگزر کی ملاقات کے بہت سے پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ محبوب انجان بن کر عاشق کے قریب سے گزر جاتا ہے اور نگاہ نہیں اٹھاتا، عاشق سوچتا ہے کہ میں نے کیا جرم کیا جس کی پاداش میں یہ ظلم روا رکھا گیا ہے

نمی دانم چہ دیدہ از من بے چارہ آں بدخو بہ بیند چوں مرا در رہ نماید دیدہ نادیدہ

عاشق شکایتوں سے بھرا بیٹھا ہے، معشوق آنکھوں آنکھوں میں اس سے پوچھتا ہے کہ کیا حال ہے وہ کیا جواب دے۔ باتیں تو ہزار ہیں، لیکن بیان کیونکر ہوں۔ نسبتی اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

چو زحالِ من بستی بنگہ سوال کردی زہجوم گفتگوہا۔ گلہ پائمال کردی

شیخ سعدی کا ایک شعر ہے:۔

دل دجانم ہمہ مشغول و نظر در چپ و راست تا نداند رقیباں کہ تو منظورِ منی

اسی مضمون کو مولانا نسبتی یوں ادا کرتے ہیں :-

نگاہ می کنم و در کساں ہمی بینم مباد راز من و تو کس از نگہ یابد

حسن و عشق کی دُنیا غیر محدود ہے، اس میں ہزاروں قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وصال کی نشاط آفرینیوں اور ہجر کی زہرہ گدازیوں کے دامن میں جس قدر حوادث و واردات پنہاں ہیں، ان کے اظہار کا نام ہی غزل ہے۔ لیکن غزل کا بہترین شعر وہی ہو سکتا ہے جس میں سوز و ساز کے ساتھ زبان کی شیرینی اور بیان کی فتادگی بھی پائی جائے۔ چنانچہ سعدی، خسرو۔ حافظ اور نظیری کے قبول عام کا سبب یہی ہے۔ اب ہم نسبتی کے رنگ کی مختلف مثالیں پیش کرتے ہیں :-

نسبتی مارا بعالم عالمے دیگر شدہ است ہستم اندر عالم و عالم نمی دانم کہ چیست

دُنیا میں ہونا اور پھر دُنیا کو نہ جاننا۔ اور اسی جہاں میں ایک نیا جہاں آباد کرنا محویت کی بہترین صورت ہے۔ مجبوری کی صورتیں ملاحظہ ہوں :-

ہر چند دو خیتم دل پارہ نسبتی، پہلوئے ہر شگاف شقے چند ماندہ است

بلبل چہ کند گناہ او نیست آں گلبن سر کشیدہ خوب است

نظر بروئے تو بے اختیار می افتد نگاہ از رخ خوبت نگاہ نتواں داشت

درد محبت کی گرانمائی ملاحظہ ہو :-

ہزار جان گرامی فدائے یک دردت کہ نیم درد تو سرمایۂ دو صد جگر است

معشوق کی طرف سے معمولی سی معمولی تکلیف بھی سیکڑوں راحتوں کی حامل اور ہزاروں لذتوں کا سرمایہ ہوتی ہے۔

آرزوئے دوست کے جانگزا نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہیں :-

سخت می ترسم کہ من بسیار می خواہم ترا آرزو خوبست اما ایں قدرہا خوب نیست

میر نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے :-

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

لفظ "سخت" کا استعمال ملاحظہ ہو :-

می کنم سخت یاد او امروز، غالباً یاد کردہ است مرا،

کہتے ہیں کہ اگر کسی کو یاد کیا جائے تو وہ بھی اس کا اثر محسوس کرتا ہے۔ اس مفروضہ کے ماتحت نسبتی کہتے ہیں کہ میری بے قراری کا باعث اس کا یاد کرنا ہے

رشک جوں جوں حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ عاشق کی پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حسن کی یہ عالمگیری دُنیا کو اپنا مسحور کرلے گی اور یہی اسے گوارا نہیں۔ اس جذبۂ رشک کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

رشکِ من چوں عشقِ من ہر روز می گردد فزوں — خوب تر می گردی و من بدگماں تر می شوم

رشک کے اور بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

نہ طرب بہانہ شادمانیہاست — عشق و سوداس بدگمانیہاست

چہ بری تو نام دشمن بہ بہانۂ شکایت — گلہ گر مراد داری، گلہ کن ولے زما کن

من تلخکام گشتم ازیں رشک و مردماں — نامِ لبت برند و دہاں پر شکر کنند

ہر کہ سودائے کند اول بہ بیند سود را — در زیانِ چند دادم جانِ غم فرسود را

سودا کرنے والے کی نظر پہلے نفع پر پڑتی ہے۔ لیکن میری تجارت دیکھئے کہ جان کے عوض چند نقصان خرید لئے۔ لیکن اس زیانکاری کے "سود" کو دیکھئے کتنا بلند ہے۔

قیمتِ دوستی چہ می پرسی — عاشقی صد زیاں و یک سود است

عاشق چاہتا ہے کہ یار کی نظر بار بار اس پر پڑے۔ ذرا اس کا حسنِ طلب اور اندازِ بیان کا فریب ملاحظہ فرمائیے :-

نگاہے چند باید کرد تا فارغ کند ما را — یکے جاں می برد از ما یکے دل را یکے دیں را

نظیری کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

! بافغانی کا ایک مشہور مطلع ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہا است بتاں را کہ نام نیست

نظیری اور فغانی کے اشعار میں جو فرق ہے۔ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نظیری فرماتے ہیں :- "سر سے پاؤں تک جہاں کہیں نظر جا پڑتی ہے کرشمہ، دامنِ دل تھام لیتا ہے کہ دیکھنے کے قابل جگہ اگر ہے تو یہی"۔ گویا نظیری کے نزدیک قامتِ یار کی "ادائیں اور کرشمے" اصل حسن ہیں۔ مگر فغانی فرماتے ہیں۔ کرشمہ و ناز و خرام ہی کا نام حسن نہیں۔ اور بھی بیسیوں جانستاں ادائیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں

ورائے عشوہ و ناز و خرام و رعنائی — دگر ہزار بلا ہمرہ است بالا را

عام خیال ہے کہ وصل سے دل کا اضطراب ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اہلِ بصیرت جانتے ہیں۔ کہ وصل میں شوق کی آگ اور بلند ہوتی ہے اس رمز کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :-

دل بدرد آمد مرا در بزم وصلش نسبتی — در بہاراں تازہ می گردد جنوں دیوانہ را

حافظ نے بھی یہ نکتہ سمجھایا ہے لیکن دو شعروں میں ؎

بلبلے برگِ گلِ خوش رنگ در منقار داشت — دندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل این ناله و فریاد چیست — گفت ما را جلوۂ معشوق در این کار داشت

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی

نسبتی اس سے پہلے یوں کہہ گئے تھے ؎

عیش گر نیست "کارِ دیگر" است — نیست بے کار کارخانۂ ما،

اگرچہ مرزا کا شعر زیادہ چست ہے، لیکن نسبتی نے "کارِ دیگر" کے ابہام سے ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔

دعا و دشنام کے پامال مضمون کو نسبتی نے یوں لکھا ہے :-

گفتیم دُعا و داد دشنام — یعنی کہ شنیدہ ام دُعا را

باز آکہ باز رنگ بکار آورد کسے — آبے کہ رفتہ باز بیاید بجوئے ما

کہنے کو تو عاشق کہتا ہے کہ تو لوٹ آئے گا تو ہم پھر زندہ ہو جائیں گے مگر اس واپسی کو "آب رفتہ بجوئے باز آمدن" سے تعبیر کر کے دلی خدشات و نا اُمیدی کا اظہار بھی کر رہا ہے۔ یعنی اس دُعا کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔ دو محاوروں کو کس خوبی اور حسن کے ساتھ نظم کیا ہے

بعض اوقات انسان کا دل نامعلوم طور پر اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا ہے۔ لیکن انسان اس اذیت کے باوجود چپ رہتا ہے

گفتہ ام آزردہ دل۔ اما نمی دانم۔ چرا — شکوہ است کردن نیارم باہمہ آزارہا۔

رندی و سرمستی کے خیالات، دنیا کی بے ثباتی اور صلائے عشرت و نشاط کے مضامین خیام اور حافظ نے جس جوش و خروش کے ساتھ ادا کئے ہیں فارسی شاعری میں کسی نے کم ادا کئے ہوں گے۔ نسبتی نے اس موضوع پر نسبتاً کم خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

نیست دوراں را بقائے دور۔ دورِ ساغر است — غم مخور از دورِ گردوں، خوش بگرداں جام را

نسبتی مے خوردۂ۔ اسباب قیل و قال چیست — اینک اینک آتش است و اینک اینک دفتر است

نسبتی بادۂ بریادِ لب او نوش دیم — فصلِ گل بر من و تو خندہ زناں می گزرد

بے وجد مرد کہ رادِ عشق است — مستانہ بزن دو گام و می رقص،

تا کے غم صبح و شام خوردن — مے می خور و صبح و شام می رقص

از پا منشیں بیائے خم ہم — در دست بگیر جام و می رقص

شراب خوردم دافر و ختم ستارۂ خویش، — ز ذرہ اختر و از اختر آفتاب شدم

مے باقی و ماہتاب باقی ست — مارا بتو صد حساب باقی ست

رودے، سرودے، وشرابے وکبابے — از عمر بگیرید حریفانہ حسابے
خرقہ بردوش، صراحی بہ بغل، جام بکف — می خورم بادہ ببازار بپانگِ دَ دَف

کوئے یار میں پہونچ کر عاشق کے قدم رُکنے لگتے ہیں۔ گویا کسی نے پاؤں سے طاقت رفتار سلب کر لی۔ یہ مضمون بہت ہی عام ہے۔ تقریباً تمام شعرا نے اس پر خامہ فرسائی کی۔ لیکن نسبتی نے جس انداز سے اس کو پیش کیا ہے وہ بھی دیکھئے :۔

یارب! سرِ کوچۂ کہ۔ باشد؟ — ایں راہ۔ کہ دیر می شود سطے
از سرِ کوئے تو ہر گہ روئے در رہ می کنم — راہ کم کم می سپارم۔ گام کوتہ می کنم
ایں سر کو، راست بگو، جائے کیست؟ — بے سبب، پائے ز جا می رود

کہنا تو یہ ہے کہ معشوق بے وفا ہوتے ہیں اور ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن طرزِ ادا کی بلاغت دیکھئے

نمود وعدۂ قتلم دو چشم او، لیکن — چہ اعتماد تواں کرد قولِ مستاں را

جب عشق مکمل ہو جاتا ہے، تو پھر ہجر و وصال کی تمیز اٹھ جاتی ہے

تفرقۂ ہجر و وصل لازمۂ عاقلی است — ہست یکے روز و شب عاشقِ دیوانہ را

تکالیف سہتے سہتے آدمی ان تکالیف کو بھی لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس خیال کو محتشم کاشی نے یوں ادا کیا ہے

ایں جورِ دیگر است کہ آزارِ عاشقاں — چنداں نمی کنی کہ بہ بیداد خو کنند

نسبتی کہتے ہیں :۔

جورِ تو التفات دگر بود بر دلم — گم کردۂ برائے چہ ایں التفات را
لباس عربدہ بر قدِ غمزہ ات تنگ است — چہ دشمنی تو کہ جنگ تو آشتی رنگ است

عشاق کے دل چھیننے والی چیز "غمزہ و ادا" ہوتی ہے، اس لحاظ سے "غمزہ" جنگ ہوا لیکن وہی چیز جس کا نام غمزہ ہے عاشق کو سب سے زیادہ محبوب ہے اس لئے اسے آشتی سے تعبیر کیا

در وصل عیش مے کشد و در فراق غم — مانند شعلہ حُسن ترا پشت و رو یکے است

شعلہ کا کام جلانا ہے۔ سیدھے۔ اُلٹے جس رُخ اس کے سامنے جائیں گے۔ وہ جلائے گا۔ یہی مثال ترے حُسن کی ہے وصل و فراق دونوں حالتوں میں تباہ کن ہے

زندگی شدائد و نوائب کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر ایک مشکل حل ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب جادۂ حیات کی ساری اُلجھنیں اور تمام پیچیدگیاں دور ہو گئیں۔ اس کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :۔

یک گرہ گر وا شد از کاکل۔ چہ سود، — شانہ را صد کار باہر موئے اوست

دنیا دل لگانے کے قابل نہیں - اوروں نے کیا نفع پایا - جو تمھیں کسی فایدہ کی امید ہو - یہ مضمون ہزاروں طرح بندھ چکا ہے - شیخ سعدی نے یوں فرمایا ہے :-

دل دریں پیر زن عشوہ گر دہر مبند — کیں عروسے است کہ در بند بسے داماد است

خواجہ حافظ یوں نصیحت کرتے ہیں :-

مجو درستی عہد از جہانِ بے بنیاد — کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

لیکن نسبتی نے ایک نیا اسلوب بیان اختیار کیا ہے ؎

سیکے ز باغِ ہوس - "نوبر مراد" نخورد — ہزار مرغ بریں کہنہ شاخسار نشست

مضمون آفرینی اور جدت بیان کی مثال ملاحظہ ہو :-

فہمید زبانِ آں دو ابرو — گویا کہ دو چشم من دو گوش است

خندہ خندہ ہیچ گہ عالم نپرسیدی بناز — گریہ گریہ آبروئے دیدۂ خونبار رفت

خندہ خندہ اور گریہ گریہ کی تکرار و تقابل نے شعر میں جان ڈال دی ہے

ہزار دے بگزشت و ہزار فصل بہار — ولیک از دل پرخون لالہ داغ نرفت

اس مضمون کا مشہور شعر ہے :-

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل — کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

لیکن نسبتی کا انداز بیان بہت شاعرانہ ہے، شاعر بھی انھیں چیزوں کو دیکھتا ہے جنھیں عام لوگ دیکھتے ہیں لیکن شاعر کا نقطۂ نظر بدلا ہوا ہوتا ہے - فرہاد و شیریں کے معاملہ کو نسبتی جس نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ یہ ہے :-

لالہ است از قتل گاہِ کوہکن در بیستوں — خون ناحق رفتہ رفتہ دامنِ صحرا گرفت

مرزا غالب نے جب لالہ و گل کو دیکھا تھا تو ان کے دل نے یہ صدا دی تھی :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

مصیبت اور تکلیف عشق کی پہلی منزل ہے، بہت پامال مضمون ہے مگر نسبتی نے اس انداز سے تازگی پیدا کی ہے :-

ہر کس کہ براہ تو بیفتاد در افتاد — پیچیدنِ پا - قاعدۂ اولِ گام است

انسان اپنی غلطیاں دوسری کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں - اور اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتے کہ اپنی خطا کا اعتراف کر لیں - اگر کوئی ایسا موقع پیش آئے کہ ماننے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے - تو پھر یہ کہہ کر کہ میرا قصور تو نہ تھا فلاں نے مجھے اس غلط راستہ پر لگا دیا، الزام سے اپنی بریت ثابت کی جاتی ہے - ذیل کے شعر میں انسانی فطرت کے اسی پہلو کو تمثیل کے پیرایہ میں بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ؎

نسبتی دل از مزاج خویشتن افتادہ است — بے دماغیہائے خود را خردہ بر ما گرفت

کسی دلیل کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لفظاً آخر ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ مسکت سے مسکت دلائل ٹوٹ سکتی ہیں۔ اور رد کر دی جاتی ہیں۔ فلاسفہ کو جو لوگ گمراہ کہتے ہیں۔ ان کے پاس یہی بڑی دلیل ہے ؎

اے نسبتی تو چند بری نام چون و چند — چندیں ہزار وسوسہ در بند و چون تست

عارفِ روم نے اسی مسئلہ کو ان دو اشعار میں سمجھایا تھا

پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

گر باستدلال کار دیں بدے — مخبرِ رازی رازدار دیں بدے

لیکن نسبتی نے ایک شعر میں ادا کر دیا اور زیادہ پُر لطف انداز سے۔

بلند بالا ہونا حُسن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نسبتی فرماتے ہیں۔ نہیں وہ چیز جس کا نام حسن ہے کچھ اور ہے ؎

قامتش سخت دلکش افتاد است — ورنہ قدِ بلند، بسیار ست

نسبتی لفظ سخت کا استعمال اکثر کرتے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ

نظیری نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر کہا ہے :-

حسن تو زیور تو بس است ایں قدر چرا — بر گوش و سینہ زحمتِ زیور نہادۂ

جب تک امتحان۔ آزمایش اور مقابلہ نہ ہو، کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ نسبتی کا شاعرانہ انداز بیان ملاحظہ ہو :-

شمع روشن کن کہ تا روشن شود احوالہا — در تہِ بال و پرِ پروانہ چندیں دفتر است

خاموش گشتہ تو و لے گفتگو بجاست — چندیں حدیث بالبِ خاموش رفتہ است

یعنی تری خاموشی لاکھ زبانوں کی ایک زبان ہے۔ اس لئے اگر تو خاموش ہو گیا تو کیا ہوا۔ ہنگامۂ گفتگو اسی طرح گرم ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے حافظہ میں کوئی چیز چٹکیاں لیتی ہے۔ لیکن یاد نہیں آتی، نسبتی اس خیال کو یوں ظاہر کرتے ہیں :-

چہ حکمت است ندانم کہ نام من او را — بدل ہمی رسد و ہمچناں فراموش است

اسی مضمون کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے اس طرح ادا کیا ہے :-

نسبتی ہر چہ در دل است از تو — بر زباں آید و ادا نشود

دیر و حرم کے جھگڑے اور یہ ظاہر پرستیاں اسی وقت تک ہیں۔ جب تک انسان خدا شناس نہیں ہوتا۔ عرفان حاصل ہونے کے بعد مسجد و مندر کے جھگڑے ختم ہوتے ہیں، نسبتی اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

مرا از دیر پیدا گشت آں گم گشتۂ مسجد مگر پیں کوچۂ از کعبہ در بتخانہ مے آید

عرفی نے اسی مسئلہ کو یوں سلجھایا ہے :۔

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

کسی دوسرے عارف نے اسی باب میں یوں اظہار خیال کیا ہے :۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست

نسبتی کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی ہے۔ اس کا ہر شعر زندگی کے متفاول رُخ سے بحث کرتا ہے اور تمام پہلو کو بہت کم سامنے رکھتا ہے، ملاحظہ ہو :۔

تا ہست دست و بازو، در کار دار دستے انداز دست، شاید یکرہ بدامن افتد

یعنی بڑے بڑے تارک الدنیا جب دنیا کی دلفریبیوں کو دیکھتے ہیں تو حسرت بھری نظریں اس پر ڈالتے ہیں۔ نسبتی نے اس خیال کو کیسے اچھوتے انداز سے ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

نگاہ از پسِ سر می کند بصد حسرت ہر آں شکار کہ از پیش دام می گزرد

عرفی از صید گہ اہلِ نظر دور مرو کہ سگے گوشۂ چشمے بشکارے دارند

عرفی کو یقین ہے کہ کسی کا التفات ضرور کسی وقت شکار کی طرف پھر مایل ہوگا۔ اس لئے وہ دور جانا نہیں چاہتا۔ لیکن نسبتی کہتے ہیں :۔

بر امیدے زندہ می باشم دریں نخچیر گاہ یار، می گویند، گاہے قصدِ لاغر می کند

"می گویند" کہہ کر شک کا اظہار کرتا ہے۔ یعنی معلوم تو ہے۔ کہ لاغر کو کوئی شکار نہیں کرتا۔ لیکن محض دل خوش رکھنے کے لئے ہم نے اس ناقابل یقین بات پر امید کی عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔ اور اس نخچیر گاہ میں جی رہے ہیں۔ صحیح رنگ تغزل ملاحظہ ہو

بودیم زخود بے خبر افتادہ و لیکن در سینہ خلیدی و بیک بار خبر شد

ہم اپنے آپ سے بھی بے خبر پڑے تھے کہ اچانک تو نے دل میں چٹکی لی، اور ہم خبردار ہو گئے

ایک اور شعر :۔

ملامتہائے پے در پے ندامتہائے گوناگوں کسے داند کہ او چوں من بہر افسانہ می سوزد

وہی شخص پے بہ پے ملامتوں اور گوناگوں ندامتوں سے واقف ہو سکتا ہے جو میری طرح ہر افسانہ پر تڑپ اٹھے۔

(باقی)

فضل حسین تبسم

سیاسیات یوروپ

(۷)

جمہوریت فرانس کا نقطۂ نظر

یوروپ میں فرانس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں زراعت و حرفت دونوں کا زور برابر پایا جاتا ہے اور اس لئے وہ بہ نسبت جرمنی اور برطانیہ کے بیرونی بازاروں سے زیادہ بے نیاز ہے اور اسے غیر ممالک سے بہت کم سامان خریدا منگانا پڑتا ہے

فرانس کی ریڑھ کی ہڈی وہاں کا متوسط طبقہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے زمیندار و کاشتکار شامل ہیں اور ان کی مالی حالت ایسی ہے کہ حکومت مفلس ہو جائے تو ہو جائے لیکن ملک نادار نہیں ہو سکتا۔ لورین کے آہنی معدنیات فرانس کی صنعت و حرفت کو اتنا ابھارے ہوئے ہیں کہ اسے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں

یہ ہے فرانس کی اقتصادی حالت جس سے وہ بہر حال مطمئن ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی سن لیجئے جس کا دور کرنا نہ جمہوری حکومت کے بس کی بات ہے نہ کسی سرمایہ دار کی اس کا تعلق نہ اندرونی اقتصادیات سے ہے نہ سرحد ہائے سے اور نہ قدیم دشمن جرمنی سے بلکہ اس کا تعلق صرف سماج سے ہے اور وہ یہ کہ وہاں کی پیدائش کا اوسط بہت کم ہوتا جا رہا ہے

۳۴ء میں وہاں کی پیدائش ۶۷۷۳۶۵ تھی اور اموات ۶۳۸۵۲۵، یعنی صرف ۴۰ ہزار زیادہ ۳۵ء کے ابتدائی تین ماہ میں پیدائش کا اوسط بہ نسبت ۳۴ء کے ۱۰ ہزار اور کم رہا۔ ۳۴ء میں پیدائش کا اوسط ۱۷ فی ہزار تھا اور اموات کا ۱۵ فی ہزار۔ لیکن اب یہ اوسط بھی برابر گھٹتا جا رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جرمنی کو دیکھئے وہاں پیدائش کا اوسط ۱۸ فی ہزار ہے اور اموات کا ۱۰ فی ہزار۔ اٹلی میں ۲۳ اور ۱۳ کی نسبت ہے اور روس میں ۴۴ اور ۲۶ کی

ہر چند جرمنی میں بھی یہ اوسط قابل رشک نہیں ہے پھر بھی فرانس سے زیادہ ہے، کیونکہ جرمنی آبادی میں سالانہ گیارہ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے اور فرانس کی آبادی میں صرف سات لاکھ کا اس لئے اگر فرانس کی ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ کی آبادی ماورائے رہائن کی جرمن آبادی کو جو ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے، بیم و ہراس کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے تو تعجب کی بات نہیں، چنانچہ یہی وہ اندیشہ تھا جس کی بنا پر مارشل فوش نے ایکبار مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ فرانس اور جرمن کے مسئلہ کا حل یہی ہے کہ دو کروڑ جرمن مردوں کو آختہ کر دیا جائے

ہر چند فرانس میں اسلحہ کی تجارت بہت وسیع ہے، لیکن عام طور پر وہاں کے لوگ بہت صلح پسند ہیں اور تاجروں زمینداروں اور کاشتکاروں میں کوئی ایسا نہیں جو جنگ کو پسند کرتا ہو۔ جو مختلف حکومتوں نے اپنا نصب العین ظاہر کرنے کے لئے مختلف جملے وضع کئے ہیں۔ مثلاً جرمنی کا مقولہ یہ ہے کہ "جرمنی ہر چیز سے بلند ہے"[1]، برطانیہ کا مقولہ ہے کہ "حکومت تو برطانیہ کی ہے"[2]، لیکن فرانس کا کہنا صرف یہ ہے کہ "فرانس کو زندہ رہنے دو"[3]

الغرض فرانس صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ مرے نہیں زندہ رہے، اپنی زمینوں کی کاشت کرتا رہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کو قائم رکھے۔ فرانس کے انسان کی تین خصوصیات بہت عجیب ہیں:۔ صحت فکر، توازن اور صداقت۔ وہ مبالغہ، شیخی اور بڑھ چڑھ کے باتیں بنانا پسند نہیں کرتا، اور امن و سکون چاہتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے وہ محض اپنی حفاظت چاہتا ہے اور اقتصادی حیثیت سے روپیہ بچانا پسند کرتا ہے۔ وہ ترقی چاہتا ہے لیکن اپنے اجتماعی حرکت و عمل سے، اپنی محنت و ذہانت سے، دوسروں کا حق غصب کر کے نہیں

فرانس کو گزشتہ جنگ عظیم میں بظاہر جو کچھ ملا ہے کم نہیں ہے اور وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے پاس باقی رہے۔ درانحالیکہ انصاف سے دیکھئے تو اُن قربانیوں کے لحاظ سے جو اس نے کی ہیں، اس کو بہت کم فایدہ رہا۔ اس کو گزشتہ جنگ کے اختتام پر کیا ملا؟ ۔ السیک لورین۔ پندرہ سال کے لئے حصۂ سار جزائر کامرون، شام کا حق وکالت (Mandate) اور تاوان۔ سو السیک لورین فرانسیسی علاقہ تھا ہی جو جرمنی نے چھین لیا تھا، سار جرمنی کو واپس مل گیا، شام کی وکالت میں جتنا صرف ہو جاتا ہے اتنا ملتا نہیں، رہ گیا تاوانِ جنگ، سو جرمنی نے وہ بھی ادا نہیں کیا

سچ پوچھئے تو ۱۹۱۸ء کی صلح فرانس کو پھلی نہیں اور اب پندرہ سال بعد وہ جرمن عسکریت کا دباؤ اپنی مغربی سرحد پر دیکھ رہا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں جرمن، فرانس پر تین بار حملہ کر چکا ہے اور اب فرانس کسی طرح نہیں چاہتا کہ پھر اس پر حملہ کیا جائے

---

[1] Rule Britinia. [2] Germany on top of everything [3] Let France live.

گزشتہ جنگ عظیم کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں غلطی جرمنی ہی کی تھی درست نہیں، یقیناً فرانس بھی اس غلطی میں شریک تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ جرمن افواج نے زیادتیاں بہت کیں۔ فرانس کو اس جنگ میں جو نقصان پہونچا وہ فرانسیسی قوم کی کفایت شعار اور امن پسند ذہنیت کے لئے یقیناً ناقابل برداشت تھا۔ دو کروڑ انسانوں کا اتلاف اور ناقابل اندازہ مالی نقصان ایسی بات نہ تھی کہ فرانس اسے اتفاق کہکر خاموش ہو جاتا۔ اس نے سوچا کہ آیندہ اس امکان کا سدباب کرنا چاہئے اور اس نے اپنے مستقبل کا تعمیری پروگرام یہ قرار دیا:-

(۱) مغربی یورپ میں قوی ترین بری و ہوائی قوت (۲) توپخانہ اور آہن پوش موٹروں کی بڑی تعداد (۳) مشرقی سرحد کی قلعہ بندیاں (۴) اسلحہ و سامان حرب کی صنعت کا فروغ (۵) دنیا میں سب سے زیادہ سونے کی مقدار (۶) جرمنی کی عسکری قوت کو کم کرنا (۷) بین الاقوامی انجمن (۸) معاہدۂ لوکارنو (۹) وسطی یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں (رومانیا، زیکوسلاویکیا، جگوسلیویا) اور پولینڈ سے عسکری و سیاسی اتحاد (۱۰) محاذ اسٹریسا کے متعلق برطانیہ و اٹلی سے مفاہمت۔

لیکن باوجود اس پروگرام کی تکمیل کے بھی فرانس مطمئن نہیں ہے اور اس کا عدم اطمینان بالکل بجا ہے۔ فرانسیسی فوج اسوقت یورپ کی قوی ترین فوج نہیں ہے، روسی فوج تعداد میں اور جرمن فوج قوت میں اس سے زیادہ ہے۔ فرانس اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی لازمی فوجی خدمت کرنے والی سپاہ جرمن توپخانوں کے سامنے ایک دن نہیں ٹھہر سکتی اور ہوائی طاقت میں بھی جرمنی بالکل فرانس کے برابر ہے۔ رہیں مشرقی سرحد کی قلعہ بندیاں سو وہ زمین دوز ہیں اور جرمن طیارے ان پر آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں فرانس کی جنگی طیاریاں ۱۸۷۰ء کی جنگ کیلئے موزوں نہیں اور ۱۹۳۷ء کی طیاریاں ۱۹۱۴ء کی جنگ کے لئے

لیگ اقوام کو جو ضرب کاری جاپان نے منچوریا میں اور اٹلی نے حبشہ میں پہونچائی ہے اس نے لیگ کا اقتدار بالکل ختم کر دیا اور اب اس کے اعتماد پر فرانس یا کوئی اور سلطنت اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتی۔ وسط یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ساتھ فرانس کا اتحاد بیشک مستحکم ہے، لیکن پولینڈ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ رہا جرمنی کے غیر مسلح کرنے کا مسئلہ سو وہ اس طرح ختم ہو گیا کہ جرمن نے لیگ سے علحدگی اختیار کر لی اور اب اس پر کوئی دباؤ باقی نہیں رہا۔ روس کے ساتھ فرانس کی صلح بیشک کارآمد چیز ہے، لیکن وہ اتنی دور واقع ہوا ہے کہ کوئی فوری مدد فرانس کو اس سے نہیں مل سکتی۔ رہا انسداد اسٹریسا کا معاملہ سو اسے انگلستان و جرمنی کے بحری معاہدہ اور اٹلی کی جنگ حبشہ نے ختم کر دیا۔ الغرض یہ ہیں مشکلات فرانس کے جنھوں نے اس کو پریشان کر رکھا ہے

بریانڈ کی صدارت کے زمانہ میں فرانس کا طرز عمل جرمن کے ساتھ مصالحانہ رہا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جرمنی کی ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ کی آبادی عرصہ تک دبی حالت میں نہیں رہ سکتی، علاوہ اس کے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جرمن کی جائے وقوع وسط یورپ میں ایسی ہے کہ اگر یہ کمزور ہو گیا تو پھر دول یورپ کا توازن بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی بے لگام ہو کر

اور منہ زور ہو گیا۔ فرانسیسیوں نے رہائن خالی کیا اور اس کا جواب یہ ملا کہ تاوان جنگ بھی ختم ہو گیا۔ جرمنی کو برابر کا عسکری اقتدار دیا گیا اور اس کے جواب میں کیا ملا؟ ہٹلر۔ جرمنی کو انھوں نے سار واپس دیا اور اس کے بدلے انھیں کیا ملا؟ جرمنی میں لازمی فوجی خدمت اور ایک زبردست ہوائی بیڑا

اب اسی کے ساتھ اور الجھنوں کو دیکھئے۔ فرانس نے اسلحہ بندی کے معاملہ میں امریکہ اور انگلستان کے مقابلہ میں اپنی نسبت ۵ء۱ امتیاز کر لی ہے۔ اس لئے کیوں نہ جرمنی اپنے لئے بھی اسی نسبت کا مطالبہ کرے، اسی کے ساتھ فرانس یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ معاہدۂ ورسیلز بیکار ہو کر رہ گیا ہے اور جرمنی کے مطالبہ کرنے پر اس کے کھوئے ہوئے علاقہ کا واپس مل جانا بالکل قرین قیاس ہے۔ پھر جب حالات یہ ہیں تو فرانس کیا ہر وہ ملک جو جنگ عظیم میں کامیاب رہا تھا، بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا کہ لڑائی میں نقصان فی الحقیقت انھیں کو پہونچا جنھوں نے فتح حاصل کی تھی

فرانس کی ڈپلومیسی یہ ہے کہ جن ممالک سے اس کا اتحاد ہے وہ لیگ اقوام میں شامل ہو کر باہم گرمتحد رہیں۔ پھر اب دیکھئے کہ فرانس کا اتحاد کن ممالک سے ہے۔ انھیں سے جن کو جنگ میں کچھ نہ کچھ مل رہا تھا یعنی بلجیم، زیکوسلاویکیا اور جگوسلیویا روس کو بھی بوجہ اتحاد فرانس اسی میں شامل کر لیجئے۔ اب ان کے مقابلہ میں ان ممالک کو لیجئے جنھیں جنگ سے کچھ فایدہ نہ ہوا یعنی جرمنی، اٹلی، آسٹریا، ہنگری اور بلغاریہ۔ یہی وہ دو گروپ ہیں جن کے درمیان اختلاف قایم ہے اور فاتح گروپ آیندہ تحفظ کے لئے جتنی تدبیریں کرتا جاتا ہے دوسرا گروپ اتنا ہی زیادہ معیار تحفظ کو سخت کرتا جا رہا ہے

اب فرانس کی اور تدابیر کو ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) وہ مغربی حصۂ یورپ کے ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہوائی طاقت کے متعلق چاہتا تھا تاکہ اس طرح انگلستان اور اٹلی کے ساتھ اس کے تعلقات زیادہ مضبوط ہو جائیں لیکن اسی کے ساتھ ضرورت اس کی بھی تھی کہ مشرقی حصۂ یورپ سے بھی اس کے تحفظ کا اطمینان ہو جائے، لیکن جرمنی نے اس کو گوارا نہیں کیا اور اس لئے فرانس کی یہ تدبیر خاک میں مل گئی

(۲) وہ ایک معاہدہ ایسا چاہتا تھا کہ فرانس اور اٹلی ملکر اس کے ذمہ دار ہو جائیں کہ وسط یورپ کے ممالک کی جو سرحدیں اسوقت قائم ہیں وہ بدستور قایم رہیں گی، لیکن ہٹلر نے اسے بھی کامیاب نہیں ہونے دیا اور اب کہ اسکا قبضہ آسٹریا پر بھی ہو گیا ہے، اس کا امکان ہی باقی نہیں رہا

(۳) اسی طرح کا ایک معاہدہ وہ اور بھی چاہتا ہے جس سے پولینڈ، روس اور جرمن کی سرحدیں محفوظ ہو جائیں۔ روس تو اس پر راضی ہے لیکن پولینڈ اور جرمنی طیار نہیں۔

فرانس کے اس تمام داؤ پیچ میں قابل اعتماد بات صرف وہ معاہدہ ہے جو ۱۹۳۵ء میں روس کے ساتھ ہوا ہے اس کی رو سے ایک ملک دوسرے کی مدد کرنے پر مجبور ہے۔ زیکوسلاویکیا نے بھی روس اور فرانس کے ساتھ ایسا ہی

معاہدہ کرلیا ہے۔ لیکن جرمنی بھی، جو روس و فرانس کے اس اتحاد کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا، خاموش نہیں رہا اور اس نے ایک طرف جاپان سے اتحاد کرلیا اور دوسری طرف روم برلن محور (Rom Berlin Axis) قایم کرکے فرانس کے اطمینان کو خاک میں ملادیا

الغرض جس طرح ۱۹۱۴ء میں یورپ کے دو ٹکڑے تھے اسی طرح اب بھی ہیں اور فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تفریق ملوکیت و جمہوریت کی تھی اور اب فاسزم و اشتراکیت کی ہے

غیر فرانسیسی لوگ فرانس کے سمجھنے میں اکثر غلطی کرتے ہیں اور اس کا بڑا سبب وہاں کے صحافت کی اخلاقی پستی ہے۔ اسوقت پیرس سے ۱۰۲ روزنامے نکل رہے ہیں لیکن ایک دو کو چھوڑ کر سب غدار و ملت فروش ہیں جسوقت جاپان منچوریا میں جنگ کر رہا تھا تو فرانس کا پریس جاپان کی طرفداری میں تھا کیونکہ جاپان ان کی مدد کر رہا تھا۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ فرانک، یہاں کے پریس کو دیکر جو چاہا لکھوایا۔ لیکن اگر اس بدنما داغ کو ہم علحدہ کردیں تو اس میں شک نہیں کہ فرانس ہر لحاظ سے عجیب ملک ہے۔ وہاں کی زبان، وہاں کا لٹریچر، اور وہاں کی تہذیب پر سارے یورپ کو رشک ہے۔ لیکن جنگ کے بعد سے فرانس سمجھنے لگا ہے کہ دنیا میں محض تہذیب و شائستگی سے کام نہیں چلتا بلکہ یہاں بدتمیزی و درندگی کبھی کبھی درکار ہوتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "خوبی" اس میں کیونکر پیدا ہو۔ مغرب کی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ بڑی دلچسپی کی بات ہے کہ کس طرح ایک وقت صلح پسند قرار دے، اور کس کو سبب جنگ، کیونکہ ہر وہ ملک جو اپنے آپ کو امن و سکون کا حامی سمجھتا ہے وہی فی الحقیقت جنگ کا باعث ہے

یہ حقیقت مخفی نہیں کہ موجودہ سیاسیات یورپ کی پیچیدگی کا ایک بڑا سبب تجارتی مقابلہ (Competition) بھی ہے اور جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک بڑی تجارت اسلحہ و سامان حرب کی بھی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف امن و صلح کی خواہش کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسی چیز کی تجارت بھی کی جاتی ہے جو کیسر امن شکن ہے

جنگ میں سامان حرب کتنا صرف ہوتا ہے اور اس کی کتنی بڑی تجارت یورپ میں ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ شاید آپ کو نہ ہو

یونہی ایک گولی جس سے ایک انسان ہلاک کیا جاتا ہے اس کی لاگت صرف ایک آنہ اور قیمت تین آنے ہوتی ہے لیکن اگر ایک گھنٹے میں دس لاکھ گولیاں چلائی جائیں (جو معمولی بات ہے) تو ان کی قیمت چھ ہزار پونڈ ہوجاتی ہے۔ ایک رائفل کی قیمت صرف پانچ پونڈ ہوتی ہے لیکن جب آپ دس لاکھ آدمیوں کی فوج کو اس سے آراستہ کریں گے تو پچاس لاکھ پونڈ صرف رائفل پر خرچ ہوجائیں گے۔ ایک مشین گن کی قیمت ۱۲۸ پونڈ ہوتی ہے، لیکن یہ دیکھئے کہ

فرانس کو اپنی ۴۰ ہزار مشین گنوں کے لئے کتنا صرف کرنا پڑا ہوگا۔ ۳۷ ملی میٹر والی توپ کی قیمت ۲۰۰ پونڈ ہوتی ہے اور ایک گولہ کی تین پونڈ۔ فرانس کی بڑی توپ کی قیمت ۱۶۰۰ پونڈ ہے اور ہر فیر پہ پانچ پونڈ لاگت آتی ہے، ایک ٹینک کی قیمت ۱۶۰۰ پونڈ ہوتی ہے اور بم گرانے والے جہاز کی بیس ہزار پونڈ۔ ایک کروزر ۲۲ لاکھ پونڈ میں طیار ہوتا ہے اور ایک جنگی جہاز ۷۰ لاکھ پونڈ میں۔ الغرض جنگ سے زیادہ صرف کسی مشغلہ میں نہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ سامان حرب ہی کی تجارت سے نفع بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے

۳۴ء میں اقوام عالم نے ۸۵۲۶۰۰۰۰ پونڈ اپنی اسلحہ بندی پر صرف کئے تھے اور ۳۷ء میں یہ مصارف دو ارب پونڈ تک پہونچ گئے

اگر ہم ۳۴ء کے مصارف اسلحہ بندی کو سامنے رکھیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر ہمارے پاس اتنی رقم موجود ہو اور ہم روزانہ دو پونڈ کے حساب سے خرچ کریں تو دس لاکھ سال کے بعد بھی کچھ بچ ہی رہیگا اور اگر اس کا شمار کرنا چاہیں تو ۲۶ سال سے کم زمانہ اس کے لئے درکار نہ ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ اس تجارت میں بڑا زبردست فایدہ ہے لیکن اس کو صرف وہی حکومتیں کر سکتی ہیں جو بہت ترقی یافتہ والدار ہیں اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ہاتھ سامان حرب فروخت کر کے کثیر نفع حاصل کرتی ہیں۔

تمام دنیا میں اسلحہ کی ۹۸ فی صدی برآمد دس ملکوں سے ہوتی ہے۔ ان میں ۶۵ فی صدی کے مالک برطانیہ، امریکہ، فرانس، سویڈن اور زیکوسلاویکیا ہیں اور فرانس کے مشہور کارخانہ اسلحہ سازی (شنیڈر) نے ۳۲ء میں ۲۷ فی صدی سے زیادہ اسلحہ و سامان حرب طیار کر کے فروخت کیا:۔

آپ شنیڈر اور دوسری اسلحہ ساز کمپنیوں کے ڈائرکٹروں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فطرتاً وہ نہایت متین و سنجیدہ، بہت نیک نفس و شریف ہیں، لیکن انکا مشغلہ ہلاکت بار اسلحہ کی اختراع و تجارت ہے

اسلحہ سازی کی کمپنیوں کی حالت وہی ہے جو تحرمات سے مباشرت کرنے والے سفید چوہوں کی ہوتی ہے کہ ساتھ کھیلتے بھی ہیں اور نسل کشی بھی کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کمپنیوں میں تجارتی مقابلہ کا جھگڑا زیادہ نہیں ہے فرض کیجئے اگر ایک ملک شنیڈر کے کارخانہ سے اسلحہ طلب کرتا ہے تو دوسرا فریق دوسرے ملکوں سے سامان حرب خریدتا ہے۔ اگر ایک ملک کوئی نئی جنگی اختراع خریدتا ہے تو دوسرے ملک بھی اس کے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی ایک ملک کو سامان حرب فراہم کرنے میں یہ کمپنیاں مقابلہ پر آجائیں اور کسی کو گھاٹا ہو جائے لیکن بین الاقوامی حیثیت سے یہ سب فایدہ میں رہتی ہیں اور ان کے تعلقات ایک دوسرے سے ایسے گتھے ہوئے ہیں کہ اس وقت ساری دنیا ان کے جال میں پھنسی ہوئی ہے

مشہور بات ہے (اور غالباً غلط نہیں) کہ اسلحہ ساز کمپنیاں اپنے کاروبار میں سیاسی حیثیت سے بالکل غیر جانبدار

رہتی ہیں، یعنی جب جنگ شروع ہوتی ہے تو وہ دوست دشمن دونوں کو اسلحہ فراہم کرتی ہیں، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ سرحد پر کسی گورے کے سینے سے جو گولی نکالی جائے، وہ انگلستان ہی کے کارخانہ کی بنی ہو۔ اور یہ تو واقعہ ہے کہ گزشتہ جنگ میں ترکی اور بلغاریہ نے جو کارتوس فرانس کی فوجوں پر چلائے وہ فرانس ہی کے بنے ہوئے تھے اور عبدالکریم نے ریف میں جو اسلحہ فرانسیسیوں کے خلاف استعمال کئے وہ بھی فرانس ہی کے اسلحہ ساز کارخانوں نے فراہم کئے تھے درۂ دانیال میں ترکوں نے جن توپوں سے انگریزوں کو مار بھگایا تھا وہ توپیں انگریزی کارخانوں کی تھیں اور بارہا ایسا ہوا کہ برطانیہ کے جنگی جہاز جن سرنگوں سے اُڑائے گئے وہ برطانیہ ہی میں طیار ہوئی تھیں

بہرحال تمام وہ ممالک جو اسلحہ طیار کرتے ہیں، کبھی یہ نہیں چاہتے کہ جنگ کا امکان جاتا رہے، جنگ اور جنگ کا خطرہ ان کی دولت و سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ پھر فرانس یونتو جنگ سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے، لیکن ایک عظیم الشان اسلحہ ساز ملک ہونے کی وجہ سے وہ کبھی دنیا کے امن و سکون سے خوش نہیں ہو سکتا

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خریدفرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ برین

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اقبال کی نگاہ میں عورت کی حیثیت

جسوقت ہندوستان کے نشاۃ الثانیہ کی تاریخ لکھی جائے گی اسوقت اقبال کی اہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا محض اُردو شاعری ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے حرکت وعمل کے مظاہرے بھی اس شاعر اعظم کے مرہون منت ہیں، اسنے محض شاعری نہیں کی، قوم کو حرکت وعمل جدوجہد اور تگ ودو کے جو روح پرور نغمے سنائے اور زندگی اور زندہ دلی کا جو پیغام دیا وہ بہت حد تک ہماری بے حسی کو دفع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا

اس نے زندگی کے مسایل حل کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھائیں لیکن اس نے کبھی زندگی سے گریز نہیں کیا اور تمام سیاسی ومعاشرتی مسایل پر گہری نگاہ ڈالی۔ اُردو شاعری میں یہ گہرائی اور بلندی ایک نئے دور کی بنیاد ڈالتی ہے مثلاً چند اشعار پیش ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے — کہ تیری بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانہ کا گلا — بندۂ حُر کے لئے نشتر تقدیر ہے نوش

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز — کرسکتا ہے وہ ذرۂ مہ و مہر کو تاراج

صرف یہی نہیں بلکہ الفاظ کی جدت اور بیان کی ندرت کے لحاظ سے بھی اُردو کا کوئی شاعر ان کا مدمقابل نہیں ہوسکتا۔ کہا گیا ہے کہ اعلیٰ ترین شاعر نہ صرف اپنے تجربات سے محفوظ ہوتا ہے بلکہ ان پر غور وخوض بھی کرتا ہے۔ نیز اپنے ذہن میں ہم آہنگی کا ایک احساس پیدا کرلیتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے سارے تجربات کی جانچ کرکے ایک انتہائی کوشش میں اس کو عالمگیر اور مثالی قالب عطا کرتا ہے۔ اقبال اس معیار پر پورا اُترتا ہے اور اس لحاظ سے اُردو شاعری میں منفرد اہمیت کا مالک ہے

اقبال کی موت ایسا سانحہ عظیم ہے اور اس سے ہمارے دلوں پر ایسی شدید ضرب کاری لگی ہے کہ اس کے کلام کا تنقیدی تجزیہ ابھی ممکن نہیں معلوم ہوتا لیکن ان کے سامنے سب سے بڑی نیاز عقیدت جو پیش کی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ ہم ان کے کلام و پیام کو تحقیق کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ کہاں تک وہ ہم کو ہمارے مسائل کے

ل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اقبال ایک خاص دور اور ایک خاص ذہنیت کی پیداوار تھے اور باوجود وسعت علم اور فلسفہ
کامل عبور کے انھوں نے جو لائحۂ عمل ہمارے سامنے پیش کیا وہ ایک رجعت پسندانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ اقبال کے پیام
کے مداح ممکن ہے اس بیان پر چیں بجبیں ہوں لیکن یہ ان کی زیادتی ہے۔ جب تک شخصیت پرستی کی یہ رکیک ذہنیت ہم سے
دور نہیں ہوگی ہماری عقل پر پردہ پڑا رہیگا اور ہم عمل کے لئے بیکار رہیں گے۔ اقبال کے پیام کے ارتقا اور نصب العین پر
بھی فرصت کے وقت بحث کی جائے گی۔ اسوقت موضوع زیر بحث ان کے پیام کا صرف ایک پہلو ہے

سوسائٹی میں عورت کی حیثیت ہی وہ محور ہے جس کے گرد ہمارے سارے معاشرتی مسایل چکر لگاتے ہیں اور یہ ہماری
بدقسمتی ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے نہ تو وہ لائحۂ عمل تجویز کیا ہے جس پر ہمارے سوسائٹی کے نصف مظلوم حصہ کو گامزن
ہونا ہے اور نہ اس بات کا تصفیہ کیا ہے کہ ہم جدھر جا رہے ہیں وہ راہ ہم کو کدھر لے جا رہی ہے۔ ناممکن تھا کہ ایسا بنیادی مسئلہ
اقبال کی وسعت بیں نگاہوں سے محفوظ رہ جاتا۔ چنانچہ "بانگ درا" ہی میں اس نے اکبر کے طنزیہ انداز میں اس مسئلہ پر
روشنی ڈالی۔ اس کے بعد "ضرب کلیم" میں جس میں اس نے اکثر مسائل حاضرہ پر تبصرہ کیا ہے، ایک پورا باب اس کے لئے
وقف ہے اور پھر اپنی معرکۃ الآرا اور عہد آفریں کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (بزبان انگریزی) میں بھی اس پر
کسی سرسری نظر ڈالی ہے۔ کہتا ہے۔ مثنوی رموز بیخودی میں بھی اس موضوع سے متعلق چند اشعار ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ (بانگ درا)

اسی سلسلہ میں ایک جگہ اور فرمایا ہے ؎

یہ کوئی دن کی بات ہے، اے مرد ہوشمند — غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہیگی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض، — کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہیگی

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار میں اکبر کی شاعری کی روح حلول نہیں کر گئی ہے۔ وہی رجعت پسندی، وہی قدامت پرستی
اور جدید تمدن کے خلاف احتجاج! لیکن افسوس ہے کہ ان بزرگان قوم کے سامنے تاریخ کا یہ مسئلہ نہیں تھا کہ معاشرتی
اور اقتصادی تحریکیں، بنیادی مسایل کا پرتو ہوتی ہیں اور فرسودہ نظام کے نام لیوا طنز کے ذریعہ سے پانی کے دھارے
کو نہیں روک سکتے۔ اکبر کی شاعری میں وہ تنازع منعکس ہے جو پرانی اور نئی روشنی کے ملاپ سے، متوسط طبقہ کے مسلمانوں
میں درپیش ہے۔ اقبال کی شاعری بھی اس جذباتی ردِ عمل کا آئینہ ہے۔ مگر چونکہ وہ محقق بھی ہیں اور مفکر بھی اس لئے انھوں
نے اپنے جذبات پر فلسفیانہ رنگ چڑھا دیا ہے

اقبال کے فلسفیانہ کردار کی ترتیب اور ذہنی نشوونما میں جو اثر سب سے زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا وہ ان کا

یورپ کا سفر تھا۔ مشرقی فلسفہ کی تحقیق کے سلسلہ میں ان کو اکثر جرمن اکابر کے خیالات کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ ان کے ذہنی افق کی تشکیل میں اس تعلق نے زبردست کام کیا اور اگرچہ یہ تو قطعی غلط ہے، جیسا بعض لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں، کہ اصولاً و فروعاً ان کا فلسفہ نطشے اور برگساں کے فلسفہ کا چربہ ہے کیونکہ ایک ایسے طباع شخص پر اندھی تقلید کا الزام صداقت پسندی کے منافی ہے، لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ اقبال کے فلسفہ میں اور ان دو حضرات کے فلسفہ میں واضح اور بین مماثلت ہے۔ اس وقت گنجائش نہیں کہ نطشے اور برگساں کے فلسفہ پر گہری روشنی ڈالی جائے لیکن موضوع زیر بحث کو سمجھنے کے لئے ان حضرات کے فلسفہ کا موجودہ سیاسی تحریکوں سے تعلق کا ذکر کرنا از بس لازمی ہے۔

شوپنہار کا فلسفہ قدیم ہندو فلسفہ اپانشاد کے فیضان کا منت کش ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ رجعت پرست فسطائی تحریک کا مورث اعلیٰ بھی شوپنہار ہی ہے۔ فسطائی فلسفہ کا قریبی تعلق نطشے سے ہے جو شوپنہار کا "شاگرد" تھا۔ فلسفیانہ بحث اس موقعہ پر ہمارے موضوع سے خارج ہے ورنہ میں یہ دکھاتا کہ وہ حضرات جو شوپنہار اور نطشے کے فلسفے میں بنیادی فرق جتاتے ہیں کس حد تک غلط ہیں۔ یہ غلط فہمی بہت حد تک شوپنہار کے فلسفہ کے متناقض براہین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ کا تیسرا شخص فرانسیسی فلسفی برگساں ہے۔ یہاں پر صرف اتنا بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر صوفی "شوپنہار" فسطائیت کا مورث اعلیٰ تھا اور رجعت پسند کلبی "نطشے" اس تحریک کا ملہٹانہ نقیب، تو فسطائیت کے فلسفہ کی بنیادی تدوین کا سہرا، مادیت اور روحانیت کے امتزاج کی کوشش کرنے والے فلاسفر برگساں کے سر ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا ان ہر سہ حضرات کے بنیادی فلسفہ سے جو تعلق ہے وہ بحث کا محتاج نہیں۔ "فلسفۂ شاہین" "نظریۂ فوق البشر" فقط مستی کردار" اور بیشمار جزوی اور اساسی نکتے ہیں جو اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔

پھر قبل اس کے کہ ہم اقبال کے فلسفہ میں عورت کی حیثیت پر روشنی ڈالیں آگے ہاتھوں ذرا شوپنہار کے نظریہ پر بھی غور کر لیجئے اور اس فلسفہ کا جو عملی مظاہرہ فسطائی جرمنی میں پیش ہو رہا ہے اس کو بھی بھول نہ جائیے۔ شوپنہار عورت کی شہری حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا، وہ عورت کو قطعی نکما خیال کرتا تھا اور ان کا کام محض افزائش نسل تجویز کرتا تھا۔ شوپنہار کے رویہ میں اور قدیم ہندو فلسفہ کے معمار منو میں بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شوپنہار کا یہ نظریہ چو قرون وسطیٰ کی خصوصیت تھی آج اس بیسویں صدی میں فسطائی تحریک کے علمبرداروں کا الہام ثابت ہوا ہے۔ اور فسطائیت کا جو رویہ نسوانی تحریک کے خلاف ہے وہ نتیجہ ہے اس قریبی تعلق کا جو شوپنہار کے فلسفہ کو فسطائیت سے ہے۔ آج جرمنی کی عورتوں کے سامنے جو لائحہ عمل پیش کیا جا رہا ہے وہ "بندگی، بچہ، باورچی خانہ" کے تین عنوانوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ "بندگی" یا مذہب پرستی اس لئے کہ اس کے بغیر عورتیں اپنی آزادی کو بیچنے کے لئے آسانی سے تیار نہ ہوتیں۔ "بچے" اس لئے کہ ہٹلر کی فوج کی تعداد میں کمی کا خطرہ نہ پیدا ہو "باورچیخانہ" اس لئے کہ مرد کی فوقیت و برتری برقرار رہے اور اس لئے بھی کہ جب، مردوں ہی کو روزگار نہیں ملتا تو عورتوں کو اس کشمکش میں شریک کر لینے سے

مصیبتوں کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ ہٹلر بیانگ دہل اعلان کرتا ہے "عورتوں کا فرض محض بچے پیدا کرنا ہے جو سپاہی ہو سکیں۔ میدانِ جنگ میں قتل ہونے سے زیادہ اعلیٰ تخیل انسانیت کے پیشِ نظر نہیں!" "مادریت" کا یہ نظریہ قدیم ہندو کھشتری تخیل کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ ہٹلر کا دستِ راست گوئرنگ کہتا ہے "عورت کی جگہ گھر میں ہے۔ اس کا فرض تھکے ماندے سپاہی کی تفننِ طبع" اور ہٹلر کا پبلسٹی ایجنٹ گبلس رقمطراز ہے "عورت کا فرض خوبصورت بننا اور بچے جننا ہے۔ مادہ طیور اپنے کو نر پرندوں کے لئے سنوارتی اور انڈوں پر بیٹھتی ہیں، اس کے بدلے نر حفاظت کا کام اپنے ذمہ لیتا ہے"۔ بالکل درست، اس وحشیانہ اور حیوانی تحریک کے سامنے ایسا ہی نصب العین ہونا چاہئے جو حیوانوں کا طریقۂ کار ہو!

ان حقایق بالا کی روشنی میں دیکھئے تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ کم از کم اس معاملہ میں نطشے کا نظریہ اقبال کے تخیل پر کس حد تک اثر انداز ہوا۔ آگے میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کروں گا کہ فسطائیت کے وہ دعاوی جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اقبال کے نصب العین سے کتنے متفق ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال کچھ بھی ہو مسلمان تھا اور فلاسفر تھا اس لئے وہ شوپنہار اور مو کا ہمنوا ہو کر عورت کو برائیوں کا ملجا و ماویٰ نہیں قرار دے سکتا اور نہ عورت کی ذات کو برائیوں کا پیش خیمہ تصور کر سکتا ہے چنانچہ اپنے ناقابلِ تقلید شاعرانہ انداز بیان سے کہتا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ ۔ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی ۔ کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُر مکنوں

یہ تجزیہ و تحلیل ممکن ہے کہ بنیادی مسئلہ کی طرف سے ہم کو بہکا دے لیکن یہ صاف گو انسان کبھی الفاظ چباتا نہیں اور اپنے خیالات عورت کی حیثیت کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔ "آزادیٔ نسواں" کے عنوان کے تحت کہتا ہے ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا ۔ گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش ۔ مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند

جب اس راز کے انکشاف کا موقع آتا ہے تو اس کو اگرچہ شاعرانہ استدلال سے بیان کیا ہے لیکن اس کے معنی و مطلب قطعی آشکارا ہیں۔ کہتے ہیں ؎

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ ۔ آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

اے کاش آزادی کا یہ پیغامبر، حرکت و عمل کا یہ نقیب غور کرتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آزادیٔ نسواں یا زمرد کا گلوبند؟ اس مشتق کو یہیں پر کیوں محدود کر دیا۔ اس کو ذرا اور وسعت دی ہوتی تو "خودی" کا سارا پیغام بے معنی ہو جاتا۔ زمرد کا گلوبند ہو یا یاقوت و ہیرے کا یہ مادی اشیا خودی کا کس طرح نعم البدل ہو سکتی ہیں۔ مگر یہاں تو عورت کے لئے

خودی کا ذکر ہی نہیں آتا ہے اور یہ اعلیٰ پیام ان کے لئے شرمندۂ معنی نہیں! عورت کی حفاظت کے عنوان سے فرماتے ہیں:۔

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی، نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

یہ ایسا فاش قسم کا تناقض دعوے ہے کہ اس کی بوالعجبی ہم کو یقیناً انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کرتی اگر ہم اس نظریہ کی "تلخ حقیقت" کو قابل قبول سمجھتے۔ وہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم عورت کی "انسانیت" کو تسلیم نہیں کرتے۔ عورت اس نقطۂ نگاہ سے ایک انسانی ہستی نہیں رہتی، بلکہ یا تو وہ ایک عجیب الخلقت چیز ہے یا ایک ماورائے انسانی ہستی۔ ہمارا سارا جنسی بیوپار، کبھی نو، کبھی غیر کبھی کا معاملہ اسی بات کا ممنون ہے کہ جب ہم عورت کی جنسی حیثیت ہی پر غور کریں گے تو اس کی انسانی حیثیت معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ ہمارے اخلاق کے نام نہاد پاسباں فضول شور مچاتے ہیں۔ دراصل ان ہی کے خیال اور نظریہ کا اثر ہے کہ بے اخلاقی کا سیلاب مذہب اور قانون کی نت نئی دیواروں کے باوصف اب تک رہ کے نہیں رکا۔ رکے بھی کیسے۔ ہمارا دماغی افق اس حد تک تاریک ہو چکا ہے کہ ہم عورت کا تصور جنسی و نفسانی حیثیت کے بغیر کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ تو عورت کو محض ایک نسائی پیکر سمجھتے ہیں۔ پھر یہ واویلا و شیون کہ "اخلاقیات" کو بروئے کار لائے قدرت اور انسانی فطرت سے جنگ کے مترادف ہے۔ اور کیوں اعتراض کیا جاتا ہے کہ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر افسانہ نویس آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

"یہ زمرد کی گلوبندی" اور "مرد کی نگہبانی" کے سے الفاظ ہٹلر کو زیادہ زیب دیتے ہیں، ایک ایسے ملک اور نظام کے لئے زیادہ مناسب ہیں جہاں علم ایک بے معنی شے قرار دیا جاتا ہے اور انسانیت کا منتہائے مقصد محض جنگجوئی اور جنگ پرستی قرار دیا جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ قریب قریب گبلس کے الفاظ کے ہم معنی ہیں (یعنی مادہ پرندے اپنے کو نر پرندوں کے لئے "سجاتے" سنوارتے ہیں اور انڈوں پر بیٹھتے ہیں، اس کے بدلے نر "حفاظت" کا کام اپنے ذمہ لیتا ہے)۔ اقبال اور ہٹلر کا یہ اتحاد کتنا عجیب اتحاد ہے۔ ایک طرف اسلام کا پرستار، مساوات کا نام لیوا، آزادی کا علمبردار۔ اقبال! اور دوسری طرف جنگ کا پرستار، بربریت کا شیدا، آزادی کو بے معنی لفظ قرار دینے والا "چنگیز" ــــ ہٹلر!

اصل وجہ یہ ہے کہ اقبال مغربی تہذیب سے بیزار ہے اور ہر وہ چیز جو اس تہذیب سے تعلق رکھتی ہے اسکی نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ وہ اس بات کو ضرور محسوس کرتا ہے کہ بنیادی مسئلہ کی طرف ہمیشہ نگاہ غلط انداز ڈالی گئی ہے ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

ظاہر ہے کہ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری ساری کوشش محض اس لئے شرمندۂ کامیابی نہیں ہوئیں کہ ہم نے ہمیشہ غلط نظریے قائم کئے جس کی وجہ سے ہماری بحث بنیادی مسئلہ سے دوچار نہیں ہوئی۔ ہم نے ہمیشہ آزادی، پردہ، تعلیم کے الفاظ میں اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی لیکن کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جب تک معاشی

واقعہ ذی آزادی نہ حاصل ہو، ہماری نام نہاد آزادی محض فریب خیال ثابت ہوگی۔ یہ شکایت کرنے کے بعد کہ ؎

فکر او از تاب مغرب روشن است　　طاہرش زن، باطن او نازن است

وہ پریشان ہو کر پکار اٹھتا ہے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن　　کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

میری تو شکایت یہی ہے کہ ہماری معاشرت اور ہماری تعلیم "زن" کو "نازن" نہیں بناتی یعنی زن کا جو جنسی، صنفی اور تفریحی تخیل ہم نے قایم کیا ہے اور جو ماورائے دیگر انسانی فرایض ہے وہ بدستور برقرار رہتا ہے اور ہم زن کو صرف اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ سوسائٹی کے باغ میں خوشنما، خوش رنگ، دلفریب تتلیوں کا کام دے۔ اگرچہ سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ افزایش نسل عورت کے فرایض کا محض ایک رخ ہے (جو یقیناً لازمی ہے) لیکن سوسائٹی کی بقا بہرحال کے لئے عورت کے ذمے دیگر فرایض بھی عاید ہوئے ہیں۔ جہاں تک نسل کی حفاظت کا سوال ہے مرد اور عورت جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں کیونکہ اعضا اور عمل کی تفریق دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ یہ "تحفظ نسلی" کا فرض ہے، لیکن "تحفظ شخصی" کے لئے مرد و عورت یکساں اعضا رکھتے ہیں، یکساں فرض دونوں کے ذمہ ہے دونوں کا دائرۂ عمل ایک ہے۔ آرٹ، سائنس، صنعت، حرفت، زراعت، تجارت، سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن یہ سب تحفظ شخصی کے مظاہر ہے ہیں، ان کی بقا و تحفظ، ان کی برقراری و ترقی ایک عام فرض ہے جو مرد و عورت دونوں پر عاید ہوتا ہے جس کے لئے مرد و عورت دونوں کلیتہً یکساں حیثیت سے ذمہ دار ہیں ——— اقبال اگرچہ اپنے کو "مظلوم نسواں سے ہوں غمناک بہت" بتاتے ہیں لیکن وہ اس "عقدۂ مشکل کی کشود" اس لئے نہیں کر پاتے کہ انھوں نے ان دونوں فرایض کو خلط ملط کر دیا اور یہ کہنے کے بعد کہ

راز ہے اس کے تپ و تاب کا یہی نکتۂ شوق　　آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

وہ یہ سمجھ گئے کہ عورت کی کل کائنات اسی لذت تخلیق سے محظوظ ہونا ہے۔ یہ کہنا کہ

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر　　غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

محض لفظی بحث ہے۔ اعضا اور عمل کی یہ تفریق دونوں کے فرایض کو اتنا جدا نہیں کرتی کہ عورت محض افزایش نسل کو اپنی کل حرکت، سارا عمل، پورا فرض سمجھے اور تمام وہ ذہنیتیں اور عمل کی تمام وہ موجیں جو اس کی "انسانی" دنیا میں اٹکھیلیاں کرتی رہتی ہیں ان کو فعل عبث قرار دے اور اپنے سے بعید سمجھے اور پھر جب اس پر جایز حرکت و عمل کی دنیا حرام قرار دیجا چکی اور وہ سوسائٹی میں کوئی مہتم بالشان کام سرانجام نہ دے سکی تو کہا جاتا ہے: "مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی" اور پھر اس کو یہ کہکر بہلایا جاتا ہے ؎

اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اقبال کی حکمی اور فلسفی دنیا میں عورت کا کام محض افلاطوں پیدا کرنا ہے، ہٹلر کی دنیا میں محض سپاہی پیدا

اقبال کی "زندہ حقیقت" یہ ہے کہ عورت مرد کی دست نگر رہے، مرد اس کا محافظ رہے، عورت بچے پیدا کیا کرے اور مرد 'خودی' کے مسائل حل کیا کرے! اور جو قوم اس قعرِ مذلت میں گرنا قبول نہیں کرتی اس کے لئے یہ حکم صادر ہوتا ہے:- "اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد"۔ لیکن تاریخ محض خواہشات سے بدلی نہیں جا سکتی، یونان و روما، ہند و بابل کا تنزل و انحطاط، بوسیدگی و فرسودگی اس بات کی شاہد ہے کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اقبال کا آزاد عورت کے متعلق کہنا کہ

این گل از بستانِ ما آرائستہ بہ داغش از دامان ملت شستہ بہ

مجھے ان بوڑھی عورتوں کا خیال دلاتا ہے جو تعلیم یافتہ اور آزاد عورت کو دیکھ کر کوستی ہیں اپنے مخصوص نظریہ کا اعادہ وہ اس سلسلہ میں بھی کرتا ہے ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہی بیچارہ زن شناس نہیں

اگرچہ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فرنگی معاشرت" کیا چیز ہے۔ سامنتی تہذیب یا حرفتی تہذیب، سامراجی نظام یا فسطائی یا اشتراکی، بورژوا نظام یا پرولیتائی، کیونکہ ہر ایک میں عورت کے سامنے جداگانہ مطمح نظر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ حرفتی تہذیب جو صنعتی انقلاب کے بعد منصۂ شہود پر آئی وہ اپنے دن گزار چکی ہے اور دنیا کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے، ایک جگہ پر قیام ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ فسطائیت کے صوفی فلاسفر اسپینگلر نے تو خیر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوال مغرب" میں انقلاب فرانس ہی کو مغربیت کے زوال کا پہلا زینہ قرار دیا ہے۔ (اسپینگلر نے جو تجزیہ کیا ہے، اقبال نے اپنی کتاب تشکیل جدید میں اس کی صداقت پر مہر لگائی ہے لیکن اسپینگلر کی یہ مذہبی تشریح اس بات پر پردہ نہیں ڈال سکتی کہ جس چیز سے تہذیب کا "زوال" ظاہر ہوتا ہے وہ اخراتقری اور ابتری ہے جو موجودہ معاشرت کی بظاہر خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک نئے دور کی پیدائش کا پتہ دیتی ہے اور یہ درد و کرب محض یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہاں اس بات کا تصفیہ بخش جواب آسان نہیں کہ آیندہ دور انسانی معراج اور معاشرتی ترقی کا دور ہوگا یا دنیا پھر کئی صدی پیچھے لوٹے گی اور رجعت پرست فسطائی تحریک میں اپنے کو روپوش کرے گی۔ اقبال کا یہ سوال کہ ؎

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ مرد بیکار و زن تہی آغوش

بہت معنی خیز سوال ہے کہ ہم کو ایک بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ ہمارے موجودہ نظام میں بے روزگاری ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہے اور ہمارے تہذیب کے دعوے کو جھٹلاتی ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں آج غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ اشیا کی کمی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہم نے سائنس کی مدد سے اشیائی پیداوار کا مسئلہ تو حل کر لیا ہے لیکن ان کی تقسیم کار اور استعمال کرنے کا مسئلہ اب تک حل نہ کر سکے۔ زن کی تہی آغوشی کی شکایت ذرا فضول سی ہے۔ اگرچہ شاعرانہ تضاد کے لحاظ سے "مرد بیکار اور زن تہی آغوش" ایک نہایت ہی عمدہ طرز ادا ہے

لیکن اگر موخر الذکر الزام میں کچھ حقیقت ہے تو وہ اتنی بنیادی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پیدائش کی تعداد میں کمی ہماری موجودہ تہذیب کا ایک مریضانہ پہلو ہے لیکن اس کا احساس عام ہو چلا ہے اور اس کا تدارک تھوڑے عرصہ کی بات ہے۔

اوپر کی بحث ہم کو لاچار اس ناخوشگوار نتیجہ کی طرف لیجاتی ہے کہ اقبال نے اس مسئلہ کے حل میں جو مطمح نظر پیش کیا ہے وہ ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ "شاعر مشرق" کا نظریہ اس ذہنیت کا، غیر محسوس طور پر شکار ہے جس کے تحت مشرق اپنی پستی کا احساس کر کے مغرب پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش میں سرگرم ہے اور اگر کہیں کہیں مغرب کے داغ کو نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو اکثر اس فعل عبث کا نتیجہ محض ہماری کمزوری کو اور مستحکم کرنے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے، بہرحال یہ ضروری نہیں کہ کوئی مفکر یا شاعر ہر مسئلہ کا صحیح حل پیش کر سکے اور اگر اقبال اس مسئلہ میں ناکام رہے تو یہ ہماری بدقسمتی ہے اور اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا

ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ترکی کے قومی شاعر اعظم "ضیا" کے وہ اشعار پڑھے جس میں اس نے اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہتا ہے:۔

"جب تک عورت کی صحیح اور مکمل اہمیت نہ پہچانی جائے گی، قومی زندگی نامکمل رہے گی"

"تو پھر کیا اس کو اپنی سوئی نیزہ میں تبدیل کر دینی چاہئے تاکہ وہ ہم سے زبردستی اپنے حقوق حاصل کرے"

کاش یہ الفاظ ہمارے "ترجمان حقیقت" کے ہوتے!

سعید جعفری (ام-اس-سی)

"نگار" کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(۱۹۲۲ء) ستمبر ۱۴ر۔ (۱۹۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۱۴ر فی پرچہ (۱۹۲۹ء) دسمبر ۵ر۔ (۱۹۳۰ء) مئی ۱۴ر۔ (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۱۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۱۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) فروری، جولائی و اکتوبر ۱۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، جون، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر و دسمبر ۸ر فی پرچہ

منیجر نگار لکھنؤ

روایت و معجزہ کا دور

زندگی کا صحیح مقصود حصولِ مسرت ہے اور ذہن انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں محض جسمانی راحت و آسایش نہیں بلکہ بلند قسم کی وہ مسرت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے، جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے، جو فطرت کے مطالعہ اور حسنِ مجرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادی ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حریت فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس نے عقل انسانی کو شل کر دینا ہی اپنا مقصود زندگی قرار دے رکھا ہے۔ یہ گروہ اپنے آپ کو اہل مذہب اور "روحانیت پرست" کہتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو احساسات مسرت کو وسوسۂ شیطانی کہتا ہے۔ یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ظاہر کرتا ہے، جس کا اصطلاحی نام اس نے "حیات بعد الموت" رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی "تسبیح و تہلیل" کے لئے منتخب کر لیا ہے، پیام ربانی کے لئے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت نام ہے صرف اس چیز کا جو اس کے دل و دماغ سے پیدا ہو۔

اس جماعت نے ہمیشہ عقل و علم سے دشمنی کی، ذہن انسانی کو اس نے ہمیشہ کند رکھنا چاہا اور اس نے علم و یقین کا ماخذ ہمیشہ غیر فطری کرامات و معجزات کو قرار دیا۔ اس نے دنیا میں صرف نفرت، تعصب اور خوف کی اشاعت کی، اس نے مفکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا اس نے محنت و عمل سے ہمیشہ جی چرایا اور اسی کو برگزیدہ قوم سمجھا جسکے لئے غیب سے من و سلویٰ نازل ہو سکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے، جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے۔ جسے عقل انسانی کبھی تسلیم نہیں کر سکتی، اس میں تخلیق کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینش انسان کا بھی، اس میں تاریخ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی، لیکن بایں ہمہ یہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب

و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قایم کیا، انھوں نے ہمیشہ دُنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شامل حال ہ ں تو بارش بند ہو جائے، کھیتیاں برباد ہو جائیں، دنیا قحط و وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوع انسانی پر نازل ہوئی تو انھوں نے اس کو اپنی ہی بد دعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا، بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہوا، علم کو روندا گیا، عقل پامال کی گئی، آزادی کو مٹایا گیا، مفکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ ارباب فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا

لیکن مذاہب کا ظہور، مذہبی کتابوں کی پیداوار، خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کا وجود، کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ وحشت کے غاروں سے لیکر موجودہ دور تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے، تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے، اس میں معجزہ و خرق عادات کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو۔ ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب و روحانیت کا خیال پیدا تو وہ بالکل فطری خیال تھا، کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہونچ سکتی تھی اور اسی کو وہ سچ سمجھ کر پیش کر رہے تھے

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دیکھتے تھے اور تعجب کرتے پانی کیوں بہتا ہے، درختوں کا نشو و نما کیوں ہوتا ہے، بادل کیونکر معلق فضا میں اڑتے ہیں، ستاروں میں چمک کہاں سے آ ، چاند سورج کو کون اِدھر سے اُدھر لیجاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا، بیداری کے بعد نیند کیا روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا، زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانیوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا، اور چونکہ وہ ان کے طبعی حدوث کے اسباب سے ناواقف تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم الشان، ذیحیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور ان کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے ڈرنے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا

طلوع صباح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے، آفتاب کو اس نے ایک جنگجو عاشق مزاج دیوتا فرض کر لیا، رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مغنی، جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا اور خزاں ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چُن کر لیجاتی ہے۔ الغرض اسی طرح کی سیکڑوں تعبیریں، ہزاروں تفسیریں اپنے مشاہدات اور حوادث طبیعی کی اپنی ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جانکر پھیلانا شروع کیا۔ اقوام عالم کی روایات "اساطیر الاولین" پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد یہی تعبیریں شاعرانہ تعبیروں اور اسی قسم کے قیاسات ضعیفہ پر ہے۔ چنانچہ باغ عدن کی روایت کو دیکھئے کہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے، کیونکہ جب وہ مصائب سے گھبرا

اٹھی تو اپنی تسکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا و یوروپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے گھونگھے، سیپیاں، اور لہروں کے نشانات، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوائے چند مقبول بندوں کے کوئی جاندار نہ بچ سکا۔ توریت انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندوؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ منو نے ایکبار گنگا میں کوئی ظرف ڈبو کر پانی لیا، اس میں ایک مچھلی بھی آگئی۔ مچھلی نے التجا کی کہ مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجئے، منو نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے، آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو معہ مویشیوں کے بٹھا لیجئے، میں بروقت پہونچکر آپ کی مدد کرونگی چنانچہ منو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو وہ مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بہت بڑی مچھلی ہو گئی تھی جس کے سر پر ایک سینگ بھی نکلا ہوا تھا۔ منو نے ایک رسی اس کے سینگ سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئی اور طوفان ختم ہونے تک منو جی وہیں ٹھہرے رہے۔ ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اسکے کتنے اندیشے کتنی امیدیں کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی، کیونکہ روشنی تھا۔ آگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر چھوٹے کی حفاظت کرتا تھا، کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرے بھرے ہو گئے۔ ہرقلس بھی سورج دیوتا تھا، جونا (یونس) بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب ۲۵ دسمبر ہی کے لگ بھگ پیدا ہوئے، سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا، سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے، ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے، ہیرود نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکے میں ہلاک کیا، چالیس[1] دن کا روزہ رکھا، غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰ بھی سورج دیوتا تھے اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی سے ہوئی، چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کر لینا اسی زمانہ کی یادگار ہے کیونکہ وہ سورج کی طرف دیکھ نہ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں

اس کے علاوہ جب ہم امم سابقہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں بھی کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی، ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر ملتا ہے۔

---

[1] چالیس کا عدد مذاہب عالم کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے۔ طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی، موسیٰ چالیس دن کوہ سینا پر رہے، چالیس سال تک بنی اسرائیل صحراؤں میں پھرتے رہے،

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ کی رسم پائی جاتی ہے، لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندوؤں، مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں بھی مقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا۔ صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے۔ یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی، زندگی کی، اگنی کی، قبر انسانی کی۔ اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قایم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں بابل کی سرزمین سے جو اسطوانے یا ٹھپے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے۔ اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا

ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے۔ اساطیر نام ہے کسی بات کی تخیلی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہوگئے تھے، تو وہ غالباً کہے گا "ہاں ہوا ہوگا"۔ اگر تم اسے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا "دیکھو، کیا ہوتا ہے"۔ لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردہ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمھیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ [illegible] معجزات سے قائم کیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرانا بھی معجزوں ہی کے ذریعہ سے ہوا، اور جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لئے ہوتا تھا، دریائے نیل ان کے لئے شق کیا گیا، من و سلویٰ ان کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا، لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پرواہ نہیں کی اور جب تک بچھڑا بنا کر پوج نہیں لیا انھیں چین نہ آیا

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ، وہی مردے جن کو انھوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنھیں چنگا کیا ان پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا؟ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں

پانی کو شراب بنا دینا، سیکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، گونگے کو خاموش کر دینا، پانی پر چلنا، یہ سب وہ باتیں ہیں جنھیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انھیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل و خوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش [illegible] کے لئے مندر بنائے، قربانگاہیں طیار کیں، ان کے سامنے ناک رگڑی، قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خود خوش ہو سکتے تھے، لیکن ان آسمانی قوتوں نے

ایک نہ سنی، ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہونچا، طوفان بھی آئے، کھیتیاں بھی برباد ہوئیں، وبائیں بھی پھیلیں، جنگ بُرے حال جینا تھا وہ بُرے حال ہی جئے اور جنھیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لئے ہے، اسی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کائنات وجود میں آئی، چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا، حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع و غروب ہوتا، یہی بہار و خزاں ہوتی، گلاب اسی طرح کھلتا، انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں، وہی سمندر کا مدّ و جزر ہوتا اور وہی رات دن، وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد و برق

ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے بصری کی حالت میں گزر گیا کہ کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات و معجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخرکار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولادِ آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہرِ طبیعت کا ایک معمولی مظہر ہے

گلیلیو، کوپرنیکس اور کیپلر نے مذہب کی بنائی ہوئی ہیئت کو درہم برہم کر دیا، زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول ہو گئی ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہو گئی، آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلاء محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ تاریکی جو زمانۂ نامعلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی، آخرکار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قایم کیا اور مذہب کے درندے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگیں رہے ہیں، برونو (Bruno) کے خلاف اپنا چنگل بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کروں کا بھی قایل تھا

اسے کافر و ملحد قرار دیکر سات سال کے لئے قید کر لیا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جا سکتا ہے، لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخرکار پابزنجیر اسے قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سی لکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جلکر راکھ ہو گیا۔ الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایکبار اکھڑ جاتے ہیں تو مشکل سے جمتے ہیں، عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی

جانبازانِ علم اٹھے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دیکر وہ باتیں کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں، انھوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو دستِ ابنا دیا۔۔۔۔

بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزے روایت ہی کرتے رہے اور انھوں نے انھیں کر کے دکھا دیا۔ یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کر سکے تھے اسے علم و عقل نے پورا کر دیا

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز، ایک لامحدود ہستی کا وجود ایک لامحدود استحالۂ عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر و مآثر اسباب و نتیجہ سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہونچی۔ خدا کا رحم حاصل کرنے کے لئے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا، برہنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبویا، زلزلوں نے تباہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصول کار نہ بدلا، انسان نے لاکھوں مندر بنائے رات دن اس کی پوجا کی لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قایم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے۔ یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں، اس لئے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبری عقل پر ہے، آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گزر گیا، روایات مذہبی کا دور ختم ہو گیا اور اب بیوقوف کہلائے

قیامت قایم ہے، حشر و نشر کا ہنگامہ برپا ہے۔ مسیح اپنے تخت پر جلوہ افروز ہیں کہ ایک روح سامنے آتی ہے

مسیح :— "تیرا کیا نام ہے"

روح :— "ٹار کومیڈا" [1]

مسیح :— "کیا تو عیسائی تھا؟"

ٹار :— "تھا"

مسیح :— "کیا تو نے اوروں کو مسیحی بنانے کی کوشش نہیں کی"

ٹار :— "کی اور پوری طرح کی"

---

[1] اسپین کا وہ ظالم انسان جس نے سب سے پہلے غیر مسیحی لوگوں کے لئے جسمانی سزائیں دینے کا محکمہ قایم کرایا۔ سنہ ۱۴۲۰ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۴۹۸ء میں مرا

مسیح :- "کیونکر"

طمار :- "میں نے منکرین کو قید کیا، ان کے پاؤں میں خاردار زنجیریں ڈالیں، ان کی زبانیں کھنچوالیں، ان کی آنکھیں نکلوائیں، شکنجے میں کسوا کر ان کی رگ رگ توڑ دی اور اگر اب بھی زندہ رہے تو کھال کھنچوا کر زندہ آگ میں ڈلوا دیا"

مسیح :- "خوب کیا، اے میرے وفادار خادم خوب کیا۔ اچھا جاؤ اور قرب خداوندی میں رہکر نجات ابدی کی راحتیں حاصل کرو"

دوسری روح حاضر ہوتی ہے

مسیح :- "تیرا کیا نام ہے"

روح :- "برونو"

مسیح :- "کیا تو مسیحی تھا"

برونو :- "کچھ عرصہ تک مسیحی رہا، لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی"

مسیح :- "کیا تو نے لوگوں میں تبلیغ کی"

برونو :- "کی، لیکن مسیحیت کی نہیں، آزادی فکر و ضمیر کی، اچھا کام کرنے کی بغیر طمع ثواب اور برے کام سے بچنے کی بلا خوف عذاب، میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا، ہمدردی کا اور دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا"

مسیح :- "یہ تو گویا تو نے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا، اچھا تو جا، اسفل سافلین میں تیرا ٹھکانا ہے اور وہیں تجھے ابدالآباد تک دوزخ میں جلنا ہے"

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلہ کو دنیا اب بھی قرین انصاف سمجھ سکتی ہے؟ اور کیا مذہب کا دور معجزہ و کرامات اب پھر واپس آسکتا ہے؟

مطلوب ہیں

"نگار" جنوری ۱۹۲۷ء - نومبر ۱۹۳۳ء - جنوری و اپریل تا دسمبر ۱۹۳۴ء - جون ۱۹۳۵ء - مئی و اگست ۱۹۳۶ء فروری و نومبر ۱۹۳۷ء کے "نگار" کے پرچے جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں۔

منیجر نگار

اگر دُنیا میں ڈاکٹر نہ ہوتے

اب سے دور ایک حکیم تھے، بے روزگار اپنے سے مایوس دوسروں سے بیزار۔ یہ دیکھ کر کہ وطن میں لوگ بیمار بھی پڑتے ہیں، اچھے بھی ہوتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی ایک میں بھی انکا دخل نہیں ہوتا انھوں نے وطن سے ہجرت کی اور دیارِ غیر میں پہونچکر قسمت آزمائی پر آمادہ ہوئے۔ اتفاقاً پہلا ہی مریض ان کے ہاتھوں اِس دنیا سے چل بسا، ورثا ان کو خبر کرنے آئے، انھوں نے بھی رسماً اظہارِ ہمدردی کیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی فرمائش ہوئی "حضور والا ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ جو مریض جس طبیب کے علاج سے وفات پائے، اس کی تجہیز و تکفین بھی اُسی طبیب کے ہاتھوں عمل میں آئے"۔ طب کے قانون میں یہ دفعہ اس سے پہلے حکیم صاحب کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ مجبوراً یا اخلاقاً اٹھ کھڑے ہوئے میت کے گھر پہونچکر غسل میت کے فرائض انجام دئے، کفن پہنایا اور میت کو تابوت میں رکھا۔ رسماً تابوت اُٹھانے میں پیش قدمی کر کے ایک طرف کاندھا بھی دیا۔ لیکن اب جو دیکھتے ہیں تو ہر طرف کا کاندھا تو لوگ بدلتے رہتے ہیں ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ قبرستان بستی سے بہت دور واقع تھا۔ اُفتاں و خیزاں وہاں تک پہنچے میت کو قبر میں اُتارا، مٹی دی اور بڑی رات گئے گھر پہونچے۔

دوسرے دن سے جب کوئی مریض اُنکے مطب میں آتا تو اُس کا حال سنتے سنتے قطع کلام کر کے پوچھ بیٹھتے "اور کیوں جناب آپ کا قبرستان کتنی دور ہے؟" ظاہر ہے یہ سوال ایسا نہ تھا کہ مریض یا اس قبیل کے دوسرے لوگ ان سے مزید گفتگو کرتے۔ یہاں سے بھی پریشان ہو کر نکلے۔ اس درماندگی کے دوران میں ان کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو بظاہر نہایت بھلے مانس معلوم ہوتے تھے۔ بڑی شفقت فرمائی۔ حکیم صاحب نے نام اور پتہ پوچھا انھوں نے مسکرا کر فرمایا "انسان مجھے فرشتہ کہتے ہیں اور فرشتے مجھے شیطان" اس نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میں انسانوں کا اعمال نامہ اور مشیت کا کارنامہ ہوں میں دیکھتا ہوں تم بڑی مصیبت میں ہو۔ فرشتے تمھارے لئے دعا مانگیں یا نہ مانگیں میں تمھاری مدد کرنے کو حاضر ہوں۔ دیکھو میں تمھیں ایک گُر بتاتا ہوں۔ جب کبھی تمھارا سابقہ کسی مریض سے ہو تو یہ علامت دیکھنا، اگر نہ تو سمجھنا مریض اچھا نہ ہوگا، اُسے ہاتھ نہ لگانا۔ اگر یہ علامت نہ ملے تو جو کچھ دیدو گے، فائدہ ہوگا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔" حکیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے، "خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے بڑا احسان کیا میرے لائق جو خدمت ہو فرمایئے" شیطان مسکرایا جس میں زہر کی تلخی اور پھول کی خوشبو اور لوچ تھا، کہنے لگا "آخر حکیم ہی ٹھہرے وہی ہوا شناسی اور وہی بندے کے بنفشہ اور نیلوفر تم میری خدمت کیا کرو گے۔ جواب تک جزائے خیر اور احسان کا مفہوم بھی نہ سمجھے" حکیم صاحب

شیطان کے تیور سے گھبرائے، فوراً آداب بجالاکر رخصت ہوگئے ایک دوسرے شہر میں پہونچکر مطب کا ڈول ڈالا

صبح کے وقت ایک مریض آیا اس میں وہی علامت ملی جو شیطان نے بتائی تھی۔ انھوں نے فوراً مریض سے کہدیا علاج کرانے سے کچھ حاصل نہیں تم جلد ہی مرجاؤ گے۔ یہ گیا تو دوسرا مریض آیا اس میں بھی وہی علامت ملی اسے بھی موت کی بشارت دیکر ٹالا غرض کئی دن متواتر ان غریب کے ہاں وہی لوگ آئے جن کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ جن جن کو یہ مژدہ سنا چکے تھے وہ جاں بحق ہوتے رہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اُن کی شہرت ایسی عام ہوئی کہ مریض تو درکنار، تندرست بھی ان کے سائے سے بھاگنے لگے۔ اور یہ بیچارے جہاں کے تہاں رہ گئے!

یہ واقعہ بجائے خود صحیح ہو یا نہ ہو اس کے دلچسپ ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں شیطان کا کافی دخل ہے اور شیطان و ڈاکٹر جب یکجا ہوں تو آپ جانتے ہیں، تندرست اور مریض کا حشر یکساں ہوتا ہے۔ تندرستوں کے ساتھ شیطان کو وہی دلچسپی ہوتی ہے جو مریضوں کے ساتھ ڈاکٹروں کو ہوتی ہے۔ یا ان سب کو ریڈیو سے! آپ کو تو معلوم ہوگا بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں جو ہر مریض کو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کتنے دنوں میں اس جہاں سے گزر جائے گا۔ لیکن یہ بات میں نے کچھ قبل از وقت کہدی۔ ہاں تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج شب کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر یا طبیب نہ ہوں تو کیا ہو۔ میں نے اس سلسلہ میں آپ کو کچھ باتیں سنائیں۔ جو بظاہر صرف لطیفہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن لطیفہ بجائے خود زندگی کے بعض سنگین اور تلخ حقائق کی طرف ایک دلچسپ تعبیر ہوتا ہے!

آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا، بعض ڈاکٹروں کا برزخ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کی پیشانی پر مریض کی موت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو اکثر اپنے تمدن کا وہ دور اچھا معلوم ہوتا ہے جب ہر شخص ہر کام کے لئے موزوں نہیں خیال کیا جاتا تھا اور سوسائٹی اسبات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہر شخص جو پیشہ چاہے اختیار کرلے۔ آپ نے اکثر ایسے ڈاکٹروں کو دیکھا ہوگا جنھیں مطب کرنے کے بجائے ایکسچینج پر سٹہ بازی قسم کے مشغلہ میں مصروف ہونا چاہئے تھا۔ یا مشرقی لندن میں قہوہ کی دوکان رکھنی چاہئے تھی۔ بعض ڈاکٹروں کو دیکھکر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا ہے جیسے یہ شخص کبھی کوکین بیچنے میں سزایاب ہوچکا ہے یا بچے اور مویشیاں غیر الیجایا کرتا ہے۔ آپ ہی غور کیجئے اگر آپ بیوی سے عاجز نہ ہوں یا کسی جاہل دولتمند کے دست نگر نہ ہوں تو ایسے ڈاکٹر کو اپنی زندگی کیسے حوالہ کردیں گے۔ پھر آپ ہی غور کیجئے ایسے بزرگوں سے مُردہ شوئی، گورکنی یا میت برداری کا کام لیا جاتا ہو تو کسی کا یا قصور! اور یہ کچھ ڈاکٹروں ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہر پیشہ میں ایسے لوگ ملیں گے جو اس پیشہ کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہوتے محض پروفیسروں کو آپ ایسا پائیں گے جو نوجوانوں کو علم و اخلاق سے روشناس کرانے کے بجائے امراء کے تفننِ طبع کا زیادہ موجب بن سکتے ہیں اور جن کو مسندِ درس پر بیٹھنے سے زیادہ پرچون کی دوکان رکھنے میں لطف آتا ہے!

لیکن یہاں ڈاکٹر کے ہونے نہ ہونے کا سوال ہے، پروفیسروں کی داستان سے بحث نہیں!

میں ابھی ابھی عرض کرچکا ہوں اور بہت ممکن ہے عرض نہ کرچکا ہوں تو اب کئے دیتا ہوں کہ سائنس کی ترقی نے

دوسرے فنون کی طرح ڈاکٹری کے فن کو جتنا نفع پہونچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ڈاکٹر کو پہونچایا ہے۔ فن سے شخصیت معدوم ہونے لگی ہے۔ اب ڈاکٹر اپنی طبیعت یا اپنے وجدان پر نہ بھروسہ کرتا ہے اور نہ صحیح وجدان کی تربیت کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ وہ آلات پر بھروسہ کرنے لگا ہے یا اُن پیٹنٹ دواؤں پر جن کو تجارت نے فروغ دیا ہے۔ وہ فوٹو کا قائل ہے، اصل کے اسرار سے بالکل ناآشنا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو صرف مرض سے دلچسپی ہوتی ہے مریض سے کوئی ہمدردی نہیں!

بات یہ ہے کہ اسی دنیا کے ایک مشہور طبیب کے اصلی طبیب اور عطائی میں فرق صرف یہ ہے کہ دونوں مرض کی جان لیتے ہیں لیکن طبیب قاعدہ کے ساتھ اور عطائی بے قاعدگی سے۔ اس مقولہ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور یہ کچھ طبابت اور ڈاکٹری ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہمارے تمدن کا تمام تار و پود اسی باقاعدہ اور بے قاعدہ طریقۂ کار سے وابستہ ہے۔ ایک بادشاہ اور لٹیرے میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک باقاعدہ لٹیرا اور دوسرا بے قاعدہ بادشاہ۔ اسے بھی جانے دیجئے، اسی قاعدہ اور بے قاعدہ طریقۂ عمل نے ہم کو اپنے خالق سے بیگانہ یا نہ کر رکھا ہے۔ کوئی شخص خدا کے رحم و رحمت کا اس وقت تک مستحق نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مسلک یا مذہب سے وابستہ نہ کرلے۔ حالانکہ میرے ایسے بہتوں کا ایمان ہے کہ خدا اپنی مشیت کو پورا کرنے کے لئے نہ خود کسی مسلک کا پیرو ہے اور نہ اس کی پروا کرتا ہے!

لوگ مرنے سے پہلے نہ مریں۔ ڈاکٹروں میں ایک قوم (Specialist) یا ماہرین خصوصی کی نئی آئی ہے۔ جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس کے مخصوص معالج نہ ہوں۔ اچھا تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ آپ کے دماغ میں فتور ہے اور آپ ایمانداری سے کام لیں تو فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کسی امراضِ دماغ کے ماہر کے ہاں چلے جائیے وہ بہت ساری ٹیسٹیں کرکے آپ پر یہ حقیقت واضح کردے گا کہ آپ کے دماغ میں واقعتاً فتور ہے۔ اس کے پاس ایسے آلات ہوں گے، اس کی شہرت ایسی ہوگی اور آپ خود کچھ ایسے نیازمند ہوں گے کہ آپ کو اس کا یقین ہو جائیگا کہ آپ کا دماغ خراب ہے! آپ کو ایک دفعہ اس امر کا شک ہوا نہیں اور آپ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوئے نہیں۔ شک کرنا انسانی فطرت کا نہایت آسان اور محبوب وظیفہ ہے جس کے بارہ میں بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا علاج افلاطون کے پاس بھی نہ تھا! تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ جو چیز ارسطو و افلاطون کے پاس نہ تھی وہ کسی دیہاتی اسکول کے مدرس یا پولیس کے سپاہی کے پاس بھی نہ ہو!

میرے ایک دوست ہیں جن کا مقولہ ہے کہ آج کل کے ڈاکٹروں اور طریقۂ علاج سے سابقہ پڑجائے تو جان و مال دونوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ اول تو یہ لوگ مرض کے تشخیص کرنے میں اتنے روپے خرچ کرا دیتے ہیں کہ مریض قلاش ہو جاتا ہے پھر مریض میں قدرے توانائی بھی ہونی چاہیئے۔ ورنہ تشخیص کے سلسلہ میں اکثر اس کو در بدر پھراتے پھراتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر کے نزدیک تشخیص کی جو اہمیت ہے اس سے بحث نہیں لیکن مریض کے نزدیک تشخیص نام ہے مرض کی شدت بڑھا دینے کا۔

اس کے بعد علاج کا دور آتا ہے۔ اس میں قیمتی دوائیں، مہنگے مقامات جہاں اسے جلاوطن کرتے ہیں اور تیمارداری کے وہ ضوابط ہیں جن کو برتنے کے بعد تیماردار خود مریض بنجاتا ہے۔ ان سب سے عہدہ برا ہونے کے بعد جب موت واقع ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھر کا سارا اندوختہ ختم ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر کا بل ادا کرنا باقی ہے اور مقدمہ قائم ہونے کی دیر ہے

ایک ڈاکٹر ہیں جن سے مجھے بڑی دلچسپی ہے، بحیثیت ڈاکٹر کے بھی اور بحیثیت انسان کے بھی۔ آپ کے [illegible] آئے اور آپ ان سے رجوع کریں تو پہلے وہ پیسے کو اس نگاہ سے دیکھیں گے جس سے کوئی عراقی اپنی بیوی کو دیکھتا ہے پھر نہایت پراسرار اور رازدارانہ ہمدردی کے ساتھ دریافت فرمائیں گے، آپ کبھی کوڑھ یا اس قبیل کے دوسرے ناگفتہ بہ امراض میں تو نہیں مبتلا ہوئے ہیں اور آپ نہیں تو آپ کے بزرگ کبھی اس سے دوچار ہوئے ہیں۔ کام کی ابتدا وہ نمونیا سے کریں گے۔ اور نمونیا کو دق کا مقدمہ بتائیں گے ہر بخار کو ٹائیفائڈ یا میعادی بخار کا پیش خیمہ قرار دیں گے اور اس کے ساتھ اسکی انتہائے مدت کا بھی تذکرہ کر دیں گے اور ضمناً مریضوں کا بھی نام بتا دیں گے جو اسی مرض میں اپنی میعاد حیات ختم کر چکے۔ دواؤں کے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ مقررہ مقدار سے کم سے کم دس حصہ کم دینا چاہئے۔ اس سے دوا کی تاثیر، مریض کا امکانِ صحت، ڈاکٹر کی عافیت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چالیس سال میں ہر انسان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کا قصور ہے۔ ایسوں کا علاج بھی وہ ایک خاص اصول پر کرتے ہیں یعنی قضا تو مسلم ہے سکرات کو آسان بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ایک دن کھانا کھا کر میں فوراً لکھنے پڑھنے بیٹھ گیا، چونک پڑے، فرمایا، غضب خدا کا ایسی غلطی نہ کیا کیجئے۔ کھانا کھانے کے بعد دوران خون تیز ہو جاتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ چالیس سال کی عمر میں شریان سخت ہو جاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے دوران خون کی تیزی سے کوئی شریان پھٹ جائے فالج گرے اور موت واقع ہو جائے۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب کیا یہ علامتیں مجھ میں نظر آ رہی ہیں فرمانے لگے تم لوگ تو ہو احمق، مرض کے اسوقت قائل ہوتے ہو جب اس میں مبتلا ہو جاتے ہو، ڈاکٹر امکان کا قایل ہوتا ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا ڈاکٹر صاحب آپ لوگ کس کے قایل ہوتے ہیں امکانِ مرض یا امکانِ موت! ڈاکٹر صاحب خفا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا نخول کرلو، جب آن پڑے گی تو سر پکڑ کر روؤ گے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے لیکن انکی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے سر پھٹنے کا اتنا خوف نہیں رہتا جتنا شریان پھٹنے کا

سائنس نے امراض کے اسباب دریافت کرنے اور اس کا قلع قمع کرنے میں بڑے کارنمایاں کئے ہیں لیکن سائنس کا علمبردار بن کر امراض کا قلع قمع کرنا اور بات ہے اور مریض کی تکلیف سے تکلیف محسوس کرنا اور اس کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کرنا بالکل جداگانہ بات ہے۔ ہمارا ڈاکٹر لکیر کا فقیر ہو گیا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اس کی حرف بہ حرف تعمیل کر دی گئی یا نہیں۔ وہ مرض کا ماہر ہو تو ہو مریض کا غمگسار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ پہلے طبیب کے پیشہ کا محرک خدمتِ خلق ہوتا تھا۔ اب صرف ضوابط کی خانہ پری رہ گئی ہے

ڈاکٹروں میں دواؤں سے علاج کرنے والوں کے علاوہ سرجن بھی ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹری کے

اس شعبہ نے واقعتاً تعجب انجام دیے ہیں۔ ان سے تعرض ہونا بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس فن کی ترقی انسان کی راحت و عافیت کے لیے نہایت نیک فال ہے لیکن (Specialisation) کے جنون نے اس شعبہ میں بھی خطرہ کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ ذرا ذرا سی تکلیف میں بھی آپریشن ناگزیر سمجھا جانے لگا ہے۔ اس طریقۂ کار نے وجدان کو مزید نقصان پہونچایا ہے فوج یا محنت و مزدوری کی مانند طریقۂ علاج بھی (کچھ [illegible]) ہوتے لگا ہے یعنی آلات دین کو ہاتھ کے ہنر یا عقل کی جودت پر ترجیح دیجانے لگی ہے۔ اس میں شک نہیں سرجری کے وسیلہ سے ہم بعض تکالیف کا نہایت آسانی سے ازالہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر چیز کو مشین آشنا کر دینے سے انسانیت کے بعض جوہر رفتہ رفتہ فنا ہوتے جائیں گے اور یہ چیز انسانیت کے لئے بڑی محرومی ہے:

لیکن تو بخانہ میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ اور فیل خانہ میں بیٹھکر الم ترکیف پڑھنے سے کیا حاصل۔ اب ہماری زندگی تمام تر مشین کی زد میں آگئی ہے۔ ہمارا تصور، ہمارا تفکر، ہمارا اخلاق غرض سارے صفات حسنہ مشین کی زد میں آچکے ہیں۔ انسانیت کا عنصر انسانی زندگی سے بڑی سرعت کے ساتھ ناپید ہو رہا ہے۔ غریبوں کسانوں اور مزدوروں کے لئے اس وقت دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے، ان کے نام پر

جو کیجئے ثواب ہے آج!

اُن کی حالت بہتر و برتر بنانے کے لئے زندگی کے تمام قدیم رویّے یکسر و یکلخت منقلب کئے جا چکے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تمام تہلکہ و طغیان میں غربت و افلاس کے دور کرنے کی جتنی جد و جہد کی جا رہی ہے اتنی فکر غریب و مفلس کے لئے روا نہیں رکھی جاتی۔ غربت و افلاس کے خلاف بغاوت اور چیز ہے اور مفلس و غریب کی دلدہی اور چیز۔ مشین سے ذہن و دماغ کو بدل سکتے ہیں۔ قلوب کو گداز نہیں کر سکتے

مطلب یہ کہ وقت پورا ہو گیا۔ اور مختصر یہ کہ ڈاکٹر ہوں تو برا اور نہ ہوں تو اور برا!!

(آواز)

رشید احمد صدیقی

نگار بک ایجنسی کی چند مطبوعات

تذکرۂ خندۂ گل - ظریف شعراء کا تذکرہ مرتبہ جناب آسی عہ | فراست التحریر - تحریر سے سیرت مستقبل پر حکم لگانے کا علم مرتبہ یامین صاحب عہ
فلسفۂ مذہب - مذہب کا صحیح فلسفہ مصنفہ مقبول احمد صاحب عہ | مثنوی لالہ رخ - مترجمہ جناب بلال احمد صاحب عہ

ان کی مجموعی قیمت صرف ۱ ہوتی ہے - یکجائی حیثیت سے طلب کرنے والے حضرات للعہ رمیں مع محصول حاصل کر سکتے ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

عزیز گرامی - اس میں شک نہیں "ناسخ" کا وجود شاعری میں ایک مرض متعدی کی حیثیت رکھتا تھا جو صرف لکھنؤ تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے دہلی کو بھی تباہ کیا یقیناً شاذ [illegible] لیکن غالب کا ذکر اس درمیان میں نہ لائیے تو بہتر ہے -- آپ کو معلوم ہے کہ لکھنوی شاعری کا وہ رنگ جس نے حد سے گزر کر اسے معیوب بنا دیا اس کا "ایہام" تھا - ایک ہی لفظ اگر محل استعمال کے لحاظ سے مختلف معانی دیتا ہے تو وہ نہایت بے تکلفی سے ان سب کو خلوط کر دیتے تھے اور یہ بات غلط جگت سے پیدا ہوئی تھی - امیر مینائی کا مشہور شعر ہے :-

انگور میں یہ تھی پانی کی چار بوندیں — پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

چونکہ کھینچنا شراب کے لئے بھی مستعمل ہے اور تلوار کے لئے بھی اس لئے شاعر نے بلا تکلف شراب کو تلوار کہدیا۔ اس قسم کی لفظی "دجل شبہ" یقیناً نہایت مکروہ چیز ہے

غالب کے یہاں تلاش سے آپ کو شاید دس پانچ ہی شعر اس رنگ کے ملیں، مثلاً

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

چونکہ لفظ دم سانس کے معنے میں بھی آتا ہے اس لئے اس کے لئے سینۂ شمشیر بھی پیدا کر دیا اور دم کا باہر آنا بھی لکھدیا، حالانکہ "دم شمشیر" کا جس سے مراد "تیزی شمشیر" ہے، سینۂ شمشیر سے باہر آنا کوئی معنی نہیں رکھتا - اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو

نقش کو اسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

تصویر بھی کھنچتی ہے اور آدمی بھی کھنچتا ہے لیکن مفہوم دونوں کا جدا جدا ہے - غالب نے محض اس لئے کہ کھنچنا دونوں محل پر مستعمل ہے ایک سہل سی بات کہدی ورنہ ظاہر ہے کہ نقش یا تصویر کا کھنچنا (احتراز کرنے کے معنے میں) کوئی مفہوم ہی نہیں رکھتا - امیر مینائی کے مذکورۂ بالا شعر کے ساتھ ہی ساتھ غالب کا یہ شعر بھی پڑھئے :-

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے

یہاں بھی وہی کھینچنے اور کھنچنے کی کشمکش ہے

ایک اور شعر غالب کا یاد آیا :-

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی، — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سفر ... بھی ہوتی ہے اور آنکھ میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے دونوں کو ملا کر شعر کو مہمل کر دیا

... ہیں کہ ذرا جس پر ناسخیت کا اطلاق ہو سکے۔ آپ کو ...
... ہوا ...

... ہے اور نقص تعبیر کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ناسخ کا رنگ
اس کے یہاں یقیناً نہیں ہے، محض دو چار شعروں کو دیکھ کر ... لگانا قرین انصاف نہیں

مخلص نواز ۔ شرمندہ ہوں کہ محبت نامے کا جواب غیر معمولی تاخیر سے جا رہا ہے۔ چند دن سے دل کی عجیب حالت ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا خیال تو مجھے خیر کبھی نہیں آیا کہ اس میں اک نوع کی حریصانہ حسرت ناکامی پائی جاتی ہے، لیکن نشاط و مسرت کا مفہوم البتہ لایعنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ یہ احساس کا کند ہو جانا ہے تو بھی صحیح نہیں، کیونکہ درد و غم کا احساس بدستور باقی ہے، اگر آپ اسے دنیاوی مصائب و تکالیف کا نتیجہ بتائیں تو بھی غلط ہے، کیونکہ مجھے معلوم ہے اوروں پر کیا گزرتی ہے اور مجھ پر نہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب میں بہت تھک گیا ہوں اور میرے دماغ کو سکون کی ضرورت ہے، لیکن نہ اس قدر کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ دماغ کا سکون خود تھکا دینے والی چیز ہے ۔ مجھے آجکل سب سے زیادہ جس خیال نے مضطرب بنا رکھا ہے وہ صرف یہ کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ یہ معاملہ "بہ چہ کار کشت مارا" کا نہیں بلکہ اجنبیت کا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کی سرزمین اور یہاں کے رہنے والوں سے اجنبی تر ہوتا جا رہا ہوں اور کوئی صورت اس بُعد روحانی کی کم کرنے والی نظر نہیں آتی آپ اسے جو چاہے کہئے لیکن میں اسے ذہنی غلامی کے احساس شدید کا ردِ عمل سمجھتا ہوں

پہلے مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی تھی، اب تکلیف ہوتی ہے، پہلے خیال تھا شاید یہ تنگ نظری کم ہو جائے لیکن اب میں مایوس ہو چلا ہوں، پہلے دل کی بھڑاس نکالنے کو جی چاہتا تھا، اب دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتا ہوں

وارد ھا اسکیم کا ذکر کر کے آپ نے زخموں پر اور نمک چھڑک دیا۔ غضب خدا کا، جب سید سلیمان ندوی ایسے لوگ (جو اپنے آپ کو نہایت روشن خیال عالم دین سمجھتے ہیں) اس پر یہ اعتراض کریں کہ مذہبی تعلیم کا کوئی ذکر اس اسکیم میں نہیں ہے، تو پھر آپ ہی بتائیے کہ سوائے سر پھوڑ کر مر جانے کے چارۂ کار اور کیا رہ جاتا ہے۔ اگر یہ سب عقلمند ہیں تو مجھ ایسے بیوقوف کو ان کے ساتھ رہنے کا کیا حق حاصل ہے اور اگر میں عقلمند ہوں تو احمقوں کی اتنی بڑی جماعت میں میرا کیا کام! ہائے کوئی ایسا نہیں جو مجھے یہاں سے نکال باہر کرے، جلاوطن کر دے ۔۔۔ آزاد ملک، آزاد فضا اور آزاد خیال انسانوں کے درمیان چند سانسیں لینا اور مر جانا! اس سے زیادہ اب میری کوئی تمنا نہیں

ہندوستان کی آزادی کی طرف سے میں بہت مایوس ہوں اور اگر اتفاق سے ملک آزاد ہو بھی جائے تو یہاں کا مسلمان قیامت تک آزاد نہیں ہو سکتا، وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو جکڑتا جا رہا ہے، خود زنجیریں بنا بنا کر اپنے پاؤں

میں ڈال رہا ہے، اس کی حالت ایسے آسیب زدہ کی سی ہے جو خود اپنے سایہ سے ڈر ڈر کر بھاگ رہا ہے، وہ ایک ایسی صرع زدہ قوم ہے جسے اپنے اعضاء پر مطلق اختیار باقی نہیں، اس کی دماغی کیفیت بالکل وہی ہے جسے "اللذی یتخبطہ الشیطان من المس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے ذہنی و اجتماعی انحلال و اضطراب نے عالم سے اسے جتنا بیگانہ بنا دیا ہے اس کی تصویر غالب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

لوگ کہتے ہیں، مایوسی شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے، قومیں پستی ہی سے نکلکر دنیا میں ابھرتی ہیں، حالانکہ مجھے میں ایسی قوموں کے نام معلوم ہیں جو ایک بار ڈوبنے کے بعد پھر ابھری ہی نہیں اور یہاں کے مسلمانوں کو میں انھیں میں شامل سمجھتا ہوں

حضرت سلامت۔ فرمان گرامی پہونچا، لیکن اسوقت جب میں تمام فرایض و واجبات کی طرف سے "غیر مکلف" ہو چکا ہوں۔ تعمیل ارشاد نہ مجھ سے ممکن، نہ اس پر آپ کی باز پرس قرین انصاف۔ میں دیوانہ ہوں تو ہوا کروں، آپ کیوں بیکار مجھے ستاتے ہیں!

ذرا صبر کیجئے، چند دن میں یہ جھگڑا ہی مٹا جاتا ہے، اگر زندگی کا اتہام ہی آپ کے نزدیک زندگی ہے

ماشاء اللہ، کیا کہنے ہیں، وہ تو کہئے خیر سے آپ کی دعا پوری طرح قبول نہیں ہوئی، ورنہ شاید حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی۔ خدا کے لئے حواس پر قابو رکھئے، اس قدر اپنے آپ سے گزر جانا اچھا نہیں

پیمانہ برآں رند حرام ست کہ غالب
دربیخودی۔ اندازۂ گفتار نداند

جس چیز کو آپ نے "مایۂ عز و وقار" سمجھا ہے، اس کی حقیقت آفتاب لب بام سے زیادہ نہیں اور جن کو آپ نے رفیق و ہمدم بنایا ہے ان کی تدبیریں درماندگی سے بیش نہیں۔ ذمہ دار لوگ ایسی باتیں زبان سے نہیں نکالا کرتے معاف کیجئے، تعلق خلوص رکھتا ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں، ورنہ مجھے کیا غرض ہے کہ ہر وہ شخص جو پہاڑ سے سر ٹکرائے اسے سمجھاتا پھروں

دفتر نگار سے ہر قسم کی مراسلت میں جواب کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ اور اگر نگار کی خریداری کا امتیاز بھی حاصل ہے تو خریداری نمبر کا حوالہ بھی ہونا چاہئے۔ مینیجر نگار

باب الاستفسار

ہندوستان

(جناب جگدیش پرشاد صاحب۔ الہ آباد)

آپ نے انقلاب فرانس پر گزشتہ اشاعت میں نہایت مختصر لیکن بہت مکمل نوٹ شایع کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر تمام تاریخی واقعات اور دنیا کی تاریخ پر اسی طرح مختصر نوٹ طیار کر دئے جائیں تو اس سے طالب علموں کو بھی بہت مدد ملیگی اور عوام بھی فایدہ اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ تاریخ کی کتابیں نہ ہر شخص پڑھ سکتا ہے نہ اتنی فرصت لوگوں کو ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر باب الاستفسار کے بجائے یہ سلسلہ مستقل طور پر نگار میں قایم کر دیا جائے تو دو چار سال میں ایک نہایت مفید کتاب طیار ہو سکتی ہے۔ میری رائے میں سب سے پہلے جغرافیہ اور تاریخ کو لینا چاہئے اور اس کے بعد دوسرے علوم و فنون کو

میں چاہتا ہوں کہ جغرافیہ و تاریخ کے سلسلہ میں سب سے پہلے ابتداء ہندوستان سے کی جائے۔ امید ہے کہ آپ نہایت مختصر طور پر ہندوستان کی موجودہ حالت اور گزشتہ تاریخ پر روشنی ڈالکر مدارس کے طلبہ، مدرسین اور عام پبلک کو ممنون فرمائیں گے

(نگار) بیشک یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں کسی آیندہ اشاعت سے ایک مستقل باب اس موضوع کے لئے وقف کر دوں لیکن فی الحال کوئی قطعی وعدہ نہیں کرتا۔ اگر مدرسین و طلبہ کی طرف سے اصرار ہوا اور صحیح یقین دلا دیا گیا کہ واقعی اس چیز کی ضرورت ہے تو پھر میں اس کو شروع کر دوں گا سب سے پہلے یقیناً جغرافیہ و تاریخ ہی کو لینا چاہئے اور اس کے بعد طبقات الارض (جیالوجی) بشریات (انتھراپالوجی) عضویات (فزیالوجی) اصول صحت (ہائی جین) طبیعیات (فزکس) فلکیات (اسٹرانومی) وغیرہ کو۔ اچھا اب ہندوستان کا بیان سنئے، اور بتایئے کہ کیا اس قسم کے مختصر مقالے مفید ہوں گے

ہندوستان ایک جزیرہ نما ہے ایشیا کے جنوب میں اور ملک ہے برطانیہ کی حکومت سے متعلق۔ اسکا رقبہ ۱۸۰۸۶۷۹ مربع میل ہے۔ شمال میں اسکے ہمالیہ اور افغانستان واقع ہے اور باقی تین طرف خلیج بنگال و بحیرۂ عرب جو بحر یا سفک کے حصے ہیں جزیرہ نمائے ہند میں برما شامل نہیں ہے لیکن ہے وہ برطانوی حکومت ہی سے متعلق۔ اسی طرح بعض مقامات ایسے ہیں جو جزیرہ نمائے ہند میں داخل ہیں لیکن برطانوی حکومت سے علٰحدہ ہیں مثلاً مغربی ساحل پر گوا جو پرتگال کی حکومت میں

شامل ہے اور پانڈچری جو فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ لنکا برطانوی مقبوضہ ہے لیکن جزیرہ نمائے ہند سے علیحدہ ہے

ہندوستان کے شمال میں ایک وسیع سلسلۂ کوہستان (ہمالیہ) پایا جاتا ہے جس کی بعض چوٹیاں دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹیاں سمجھی جاتی ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ سے نیچے وہ وادیاں شروع ہوتی ہیں جہاں متعدد دریا بہتے ہیں اور آگے چلکر میدانی علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔ گنگا اور دریائے سندھ سے سیراب ہونے والے علاقوں سے آگے جنوب میں دکن کا میدانی علاقہ ہے جہاں نیلگری اور گھاٹ پہاڑیوں کے سلسلے بھی پائے جاتے ہیں اور زیادہ جنوب میں ایک بڑا دریا دریائے برہمپتر پایا جاتا ہے۔ الغرض ہندوستان کا اکثر حصہ اپنے دریاؤں کی وجہ سے بہت سیراب ہے

اس کی آبادی ۱۹۳۱ء میں ۳۵۲۸۲۷۷۸ تھی، جس میں مختلف قومیں مختلف زبانیں بولنے والی شامل ہیں۔ ان زبانوں کی تعداد ۲۲۲ ہے اور اس کی تقسیم سات سلسلوں میں کی گئی ہے۔ مغربی حصہ کی ہندی، بنگالی، تلگو، مرہٹی، تامیل پنجابی، راجستھانی اور ہندوستانی جو یہاں کی تنہا لٹریری زبان ہے۔ انگریزی بولنے والوں کی تعداد بھی تقریباً ۳۰ لاکھ ہے۔

مذہبی تقسیم میں ہندوؤں کی تعداد ۲۲۹۱۹۵۱۴۰ ہے، مسلمانوں کی ۷۷۶۷۷۵۴۵ اور بودھ ۱۲۷۸۶۸۰۶ والوں کی

شہروں میں کلکتہ اور بمبئی سب سے بڑے شہر ہیں، ان کے بعد مدراس، حیدر آباد، رنگون، دہلی، لاہور، لکھنؤ، احمد آباد، بنگلور، کراچی امرتسر، کانپور اور پونا کا مرتبہ ہے۔ ہندوستان سیاسی حیثیت سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ برطانوی ہند اور ریاستی ہند۔ ریاستیں گو بظاہر آزاد ہیں لیکن ہیں وہ برطانیہ ہی کے اثر میں۔ برطانوی ہند کا رقبہ ۱۰۹۸۳۱۳ مربع میل ہے۔ سب سے بڑا صوبہ برما تھا جو اب ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صوبۂ مدراس ہے اور پھر صوبۂ بمبئی۔ یوپی، پنجاب، سی پی تقریباً برابر ہیں۔ ان کے بعد بہار، بنگال، آسام اور بلوچستان کا نمبر ہے۔ صوبۂ سرحد، اجمیر مارواڑ اور کورگ بہت چھوٹے صوبے ہیں، جزائر انڈمان و نکوبار کا صوبہ سب سے علیحدہ ہے اور دہلی بھی اب علیحدہ صوبہ ہو گیا ہے جہاں حکومت کا پایۂ تخت ہے۔ بمبئی میں سندھ اور عدن بھی شامل تھے، لیکن اب سندھ کا صوبہ الگ ہو گیا ہے اور عدن کو بھی جدا کر لیا گیا ہے۔ بڑے صوبوں کے حاکم اعلیٰ گورنر اور چھوٹے صوبوں کے چیف کمشنر کہلاتے تھے، لیکن اب یہ تفریق باقی نہیں رہی اور سب گورنر کہلاتے ہیں

ریاستی ہند کا رقبہ (جس میں کئی سو ریاستیں شامل ہیں) ۹۰۳۳۳ مربع میل ہے اور ہر ریاست کا فرمانروا علیحدہ ہے، بڑی بڑی ریاستیں یہ ہیں:۔ حیدر آباد، کشمیر، میسور، گوالیار، بڑودہ۔ باقی ریاستیں ایجنسیوں سے متعلق ہیں۔

تمام ہندوستان کے نظم حکومت کا ذمہ دار گورنر جنرل یا وائسرائے کہلاتا ہے جو وزیر ہند مقیم لندن کے سامنے جوابدہ ہے۔ وائسرائے کی حکومت دو ایوانوں سے متعلق ہے ایک کو اسٹیٹ کونسل کہتے ہیں اور دوسری کو لیجسلیٹو اسمبلی جو ۱۹۲۱ء میں قائم کی گئی تھی اور جس کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کی رو سے صوبوں میں بھی لیجسلیٹو کونسل قائم ہو گئی۔

اصل انتظام وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل اور صوبوں کی اگزیکٹو کونسلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے، مرکزی (یعنی وائسرائے کی) اگزیکٹو کونسل کا ہر ممبر ایک یا ایک سے زائد محکموں کا انچارج ہوتا ہے اور ماتحت سول سروس کے ذریعہ سے وہ اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے

ریاستوں کے معاملات پر بحث کرنے کے لئے روسار ہند کا ایوان ہے جس میں مرکزی حکومت کی طرف سے ریزیڈنٹ صاحبان بھی شامل ہیں۔ وزیر ہند کو مشورہ دینے کے لئے لندن میں انڈیا کونسل بھی قایم ہے جسکے بارہ ممبروں میں سے دو ہندوستانی ہوتے ہیں اور ایک ہائی کمشنر بھی ہوتا ہے ـــــ یہاں کی آبادی کا ذریعۂ معاش زیادہ تر زراعت ہے۔ چاول، گیہوں اور کپاس کی پیداوار بہت ہوتی ہے۔ کوئلہ اور پٹرول کی کانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں اور اُن سے کم سونے چاندی کی بھی۔ جنگلی علاقہ بہت بڑا ہے جو ایک خاص محکمہ کی نگرانی میں ہے۔ ریلیں بھی بکثرت جاری ہیں۔ سکۂ رائج الوقت یہاں کا روپیہ ہے جو ایک شلنگ چھ پنس کے برابر سمجھا جاتا ہے یہاں کا خاص بنک امپیریل بنک ہے، لیکن اب جدید آئین کی رو سے ایک اور بنک ریزرو بنک کے نام سے قایم ہو گیا ہے۔ ہندوستانی افواج میں افسر زیادہ تر انگریز ہیں۔ انگریزی فوج کی تعداد ستر ہزار ہے۔ ہوائی فوج بھی ہے اور بحری فوج بھی۔ پولیس کی تعداد ۷ لاکھ ہے۔

تاریخ مسلمانوں کے حملہ سے قبل جسکی ابتدا ۱۰۰۰ء سے ہوتی ہے، ہندوستان کا ایک حصہ یونانیوں نے بھی فتح کیا تھا لیکن کوئی سلطنت انھوں نے قایم نہیں کی۔ البتہ مسلمانوں کے حملوں نے جو ۳۰۰ سال تک جاری رہے دکن تک تسلط قایم کر لیا تھا ۱۳۹۸ء میں تیمور نے حملہ کیا اور ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد یہاں قایم ہوئی۔ اٹھارویں صدی میں اس پر زوال آیا جسکا سبب ایرانیوں کا حملہ اور مرہٹوں کا خروج تھا۔ پندرھویں صدی میں پرتگالیوں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت شروع کی اور اس سلسلہ میں یہاں آکر مقیم ہوئے۔ اس کے بعد ڈچ، فرانسیسی اور انگریز آئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی تجارتی کمپنیاں قایم کر لیں۔ انگریزوں کی کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا جس نے آہستہ آہستہ اپنی فتوحات بڑھا کر ۱۸۵۰ء تک تقریباً سارے جزیرہ نمائے ہند پر اپنا تسلط قایم کر لیا

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی توڑ دی گئی اور ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں وکٹوریہ یہاں کی ملکہ قرار دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں کو متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنا پڑیں، اور ہر لڑائی کے بعد انکا تسلط بڑھتا ہی گیا۔

بیسویں صدی میں ہندوستان کے باشندوں میں آزادی کا خیال پیدا ہوا اور جنگ عظیم کے بعد یہ خیال زیادہ قوی ہو گیا۔ گاندھی جی نے برطانوی مال کا مقاطعہ کیا اور ستیاگرہ کو پھیلایا، لیکن اس تحریک سے پہلے ہی مطالبۂ آزادی پر حکومت نے کچھ اصلاحات کی تھیں لیکن ۱۹۲۲ء میں اصلاح کا ایک اور قدم اُٹھایا گیا یعنی مجلس قانون ساز میں اہل ملک کی نمایندہ جماعت کو جگہ دی گئی۔ ۲۷ء میں ایک کمیشن سر جان سائمن کی سرکردگی میں قایم کیا گیا تاکہ آیندہ نظم و نسق کے متعلق اپنی رائے پیش کرے ۳۰ء میں اس کمیشن کی رپورٹ شایع کی گئی۔ اس میں ایک سفارش یہ بھی تھی کہ برما کو ہندوستان سے علٰحدہ کر دیا جائے اور رائے دینے والوں میں ۶۶ لاکھ عورتیں بھی شامل کی جائیں ـــ ۳۰ء سے ۳۳ء تک گول میز کانفرنس کے اجلاس لندن میں منعقد ہوئے اور وفاقی حکومت کا آئین مرتب کیا گیا۔ مارچ ۳۳ء میں وہائٹ پیپر کے نام سے حکومت کی تجاویز اصلاحات شایع کی گئیں اور ۳۵ء میں ایک ایکٹ نافذ کیا گیا جسکے رو سے برما ہندوستان سے علٰحدہ کر دیا گیا، عدن کا تعلق ہندوستان سے جدا ہو گیا اور صوبوں کو خود مختار حکومت تفویض کی گئی۔ وفاقی حکومت میں صوبوں کی حکومتیں اور ریاستہائے ہند شامل ہوں گی۔

جدید آئین چونکہ ایک علٰحدہ موضوع ہے اس لئے اس پر اس سلسلہ میں بحث کرنا مناسب نہیں

مطبوعات موصولہ

ریاض رضوان ریاض مرحوم کے کلیات کا مجموعہ ہے، جو ان کی زندگی میں تو شایع نہ ہو سکا، لیکن اب ان کے احباب گورکھپور اور خصوصیت کے ساتھ جناب تلمذ حسین صاحب ام۔اے کی کوششوں سے شایع ہوا ہے۔ ریاض جس رنگ کے شاعر تھے اس کا علم ہر شخص کو ہے، گذشتہ دور شاعری کی یادگار یہی ایک رہ گئے تھے اور بڑا ظلم ہوتا اگر ان کا کلام شایع نہ ہوتا یا اگر شایع بھی ہوتا تو اس اہتمام کے ساتھ نہیں کاغذ، کتابت، طباعت سب نفیس ہیں اور جلد بھی اچھی ہے۔ قیمت چھ روپیہ بظاہر زاید معلوم ہوتی ہے لیکن قدر شناسانِ ریاض کے لئے اس عروس سخن کا یہ روپ کچھ نہیں ہے۔ دائرۃ الادب حیدر گڈھ، حیدر آباد دکن یا دفتر شاہکار گورکھپور سے مجموعہ ملسکتا ہے

مکاتیب مہدی یعنی مہدی حسن افادی الاقتصادی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنے احباب کے نام لکھے تھے، مہدی حسن مرحوم ایک خاص رنگ کی انشا لکھنے والے تھے اور جنھوں نے مقالات مہدی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کا انداز بیان کتنا شوخ اور لطیف ہوتا تھا جس کے نمونے ان خطوط میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ مہدی بیگم نے اس مجموعہ کو شایع کر کے اردو ادب پر یقیناً بڑا احسان کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مہدی بیگم صاحبہ سے ذریعہ احمد حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ مراسلت کی جائے

اقبال کی شاعری ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالمالک آروی کا علمی مقالہ ہے جو انھوں نے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو شاہ آباد اردو لائبریری کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ میں ابتداءً مختصر طور پر اردو شاعری کے ادوار سے بحث کی گئی ہے اور پھر بطریق گریز یہ بتا کر کہ اقبال کس اسکول کی پیداوار تھے ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے اس سلسلہ میں جیسا کہ عبدالمالک کی محققانہ فطرت کا تقاضا ہے، انھوں نے اقبال کی شاعری کے ہر پہلو پر نہایت عالمانہ انداز سے گفتگو کی ہے اور مختصراً میں اس مقالہ کی تعریف میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا!"۔ وہ حضرات جو اقبال کی عمیق شاعری کا مطالعہ عمیق نگاہ سے کرنا چاہتے ہیں، انکو اس مقالہ میں بعض باتیں بہت عجیب و غریب ملیں گی۔ سکریٹری شاہ آباد اردو لائبریری (آرہ) سے خط و کتابت کی جائے۔

ذکرِ غالب

جناب مالک رام صاحب ام۔ اے کی تالیف ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اسوقت تک غالب پر متعدد کتابیں شایع ہوچکی ہیں بعض اچھی اور بعض معمولی، تاہم بقول ڈاکٹر عابد حسین صاحب (جنکا دیباچہ اس میں شامل ہے) ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہورہی تھی جو جامع بھی ہو اور مختصر بھی۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اس ضرورت کو پورا کردیا

اس کتاب میں نہ صرف وہ تمام واقعات درج ہیں جو غالب کے متعلق دوسری کتابوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ بعض نئی معلومات بھی اس میں شامل ہیں۔ واقعات کو سلسلہ وار بہ حساب سنین درج کیا گیا ہے، جس سے سمجھنے میں بہت آسانی ہوجاتی ہے۔ میرزا صاحب کی بالکل ایک نئی تصویر اس میں شامل ہے اور اُن کے آگرے والے مکان کی بھی۔ اس کتاب کا وہ باب جس میں غالب کی تصانیف فارسی و اُردو سے بحث کی گئی ہے، مجھے بہت پسند ہے۔ انداز بیان آسان بھی ہے اور محققانہ بھی

مالک رام صاحب کو فارسی و اُردو لٹریچر سے غیر معمولی شغف ہے اور وہ ہمیشہ اس ادبی خدمت میں مشغول رہتے ہیں جن میں سے بعض کا علم لوگوں کو ہوگیا ہے اور اکثر کا نہیں۔ اس کتاب کو بھی جامعۂ ملیہ نے شایع کیا ہے۔ قیمت ۸ر ہے۔

سید حسین

میرزا غالب کا وہ کلام جو کلیات میں شامل نہ ہوسکا تھا، ۱۸۶۲ء میں سید حسین کے نام سے شایع ہوا لیکن حبیب الرحمان خانصاحب شروانی کے کتب خانہ سے دستیاب ہوگیا اور انھوں نے اس کو ایڈٹ کرکے جامعۂ ملیہ کو دیدیا۔

مالک رام صاحب نے اس میں میرزا کا وہ کلام بھی شامل کردیا ہے جو کسی مجموعہ میں شامل نہ ہوا تھا۔ گویا کلیات غالب کے علاوہ جتنا کلام غالب کا ملسکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے، اس میں میرزا کی وہ تصویر بھی ہے جو ذکر غالب میں دیگئی ہے۔ ناظرین کو مالک رام صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے غالب پر یہ دو کتابیں پیش کرکے بڑی کمی کو پورا کردیا۔

یہ کتاب ۶ر میں مکتبہ جامعہ سے ملسکتی ہے

بنی اسرائیل کا چاند

"بنی اسرائیل کا چاند" سر رائڈر ہیگرڈ کا نہایت مشہور تاریخی ناول ہے، جسے غالباً ہر انگریزی داں نے پڑھا ہوگا۔ عبدالمجید صاحب حیرت بی اے نے اسی کا ترجمہ اس نام سے پیش کیا ہے جسے مجھے سخت حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کس صبر و تحمل سے کام لیا ہوگا

ہیگرڈ کے ناولوں کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں کیونکہ اس کے افسانوں کا پس منظر ایسا پیچیدہ ہوتا ہے کہ زبان و خیال دونوں میں از خود غیر معمولی اشکال پیدا ہوجاتا ہے، لیکن حیرت صاحب نے واقعی کمال کیا ہے کہ شروع سے اخیر تک کسی جگہ اس اُلجھن کو ظاہر نہیں ہونے دیا جو قدرتاً اس ناول کا ترجمہ کرتے وقت ان کے دل و دماغ میں پیدا ہونی چاہیئے تھی

زبان و محاورہ دونوں حیثیتوں سے ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ پنجاب لاہور نے مجلد شایع کیا ہے

اور قیمت دو روپیہ رکھی ہے جو زیادہ نہیں ہے

بیوہ منشی پریم چند مرحوم کا ناول ہے جس کا دوسرا اڈیشن مکتبۂ جامعہ دہلی نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ منشی پریم چند سوشل فسانے لکھنے میں یوں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے، لیکن چونکہ یہ فسانہ انھوں نے کافی تجربہ و مہارت کے بعد لکھا ہے اس لئے ان کے فن افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ ہندو معاشرت میں بیوہ کی زندگی کیا چیز ہے اور اس میں کیا اصلاح ہونا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی ہے

دلی کی دو سو برس کی تاریخ یہ مقالہ ہے مولوی سید حسن صاحب برنی کا جو انھوں نے جامعۂ ملیہ کے اردو اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس میں حملۂ تیمور سے قبل دلی کی دو سو سال کی تاریخ مختصر و جامع طور پر درج کی گئی ہے، واقعات کے استقصاء و تحقیق میں پوری کوشش سے کام لیا گیا ہے اور ہندوستان کی تاریخ کے جتنے ممکن الحصول ماخذ ہو سکتے ہیں اُن سب سے کام لیا گیا ہے، اسے بھی جامعہ ملیہ نے شایع کیا ہے، قیمت درج نہیں ہے لیکن غالباً ۴ر سے زائد نہ ہوگی

دہلی اس چار جزو کے رسالہ میں دہلی کے آثار و صنادید کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس سے قبل سات جگہ دلی شہر کس کس جگہ آباد ہوا اور اُجڑا۔ نقشوں اور تصاویر سے اس کو زیادہ مفید و دلچسپ بنایا گیا ہے زبان و بیان کے لحاظ سے اس قدر سلیس ہے کہ ایک بچہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے، قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی

ضرب الامثال خواجہ عبدالمجید دہلوی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بعض مشہور امثال کی توجیہ بیان کی ہے اور اس سلسلہ میں جو قصہ طلب باتیں تھیں ان کو قلمبند کر دیا ہے۔ اس رسالہ میں ۸۰ ضرب الامثال درج ہیں اور ہر ایک کے متعلق وہ واقعہ یا افسانہ بھی بیان کر دیا گیا ہے جس نے اسے مشہور کیا۔ یقیناً یہ کتاب کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن فکاہی حیثیت سے خوب ہے۔ ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی، اور قیمت ۸ر ہے

ایوان تمدن ڈاکٹر ریاض احمد بیگ صاحب چغتائی کا ناول ہے جو سرزمین عراق سے تعلق رکھتا ہے انھوں نے اس فسانہ میں موجودہ عراق کے تمدن کو پیش کرتے ہوئے وہاں کی عورت کے میلان سے بحث کی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ ظاہر کیا ہے کہ تہذیب حاضر کی آزادیاں عورت کی زندگی کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں

اکثر جگہ انداز بیان عربی ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دیار عرب کی کافی سیاحت کی ہے اور اس طرح قدرتاً وہاں کے طرز انشاء سے انھیں متاثر ہونا چاہئے تھا۔ پلاٹ بہت سادہ و مختصر ہے لیکن دلچسپ عبارت صاف و سلیس ہے لیکن زبان کی لغزشوں سے پاک نہیں۔ مکالموں کے ذریعہ سے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بعض جگہ ایسے خلا پائے جاتے ہیں جن کو پُر کرنا ضروری تھا اور بعض جگہ ضرورت سے زیادہ اطناب پایا جاتا ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے حصہ میں فسانہ کا انجام واقعی کیا ہوگا۔ تاہم یہ حصہ بھی برا نہیں ہے اور لکھائی چھپائی بھی غنیمت ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔ اور ملنے کا پتہ الامان برقی پریس دہلی

مرثیۂ اقبال جناب اسد ملتانی نے رحلت اقبال پر ایک ترجیع بند لکھا تھا جسے روزنامہ شمس ملتان نے شایع کیا ہے۔ نظم اچھی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خاص تاثر کی حالت میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ۳ ر ہے

ابوالائمہ کی تعلیمات امامیہ مشن لکھنؤ کا چھپنواں رسالہ ہے جسے مولانا سید علی نقی صاحب نے مرتب کیا ہے اس میں نہج البلاغۃ کے اُن حصوں کی تشریح کی گئی ہے جو اپنے مفہوم کے لحاظ سے مابہ النزاع ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ اس کتاب کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو تعلیمات مذہب شیعہ کے منافی ہو

جناب امیر کی تصنیف اور مولانا علی نقی صاحب کی تفسیر، ان دونوں کا اجتماع کوئی معمولی چیز نہیں ہو سکتا میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ سنیوں کے مطالعہ میں بھی آنا چاہیئے۔ قیمت ۴ ر ہے اور ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ

یادگار جناب مایل انصاری خیرآبادی کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جستہ جستہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مایل صاحب کی مشق سخن اچھی ہے۔ کتابت و طباعت بہت روشن ہے اور قیمت ۶ ر۔ یہ مجموعہ جناب مایل سے خیرآباد سیتاپور کے پتہ پر مل سکتا ہے

سلسلۂ داستان گو حیدرآباد کے نوجوانوں نے سلسلۂ داستان گو کے نام سے ہر ماہ ایک مختصر سا رسالہ شایع کرنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اچھے اچھے طبعزاد اور مترجم افسانے اُردو میں پیش کیے جائیں۔ یہ پرچہ اس سلسلہ کی پہلی اشاعت ہے جس میں دو افسانوں کے ترجمے "کیا" اور "رقاصہ" کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں پہلا افسانہ سید محمد احسن بی۔ اے کا ترجمہ کیا ہوا ہے اور دوسرا علی احمد صاحب بی اے کا۔ اس سلسلہ کا مقصود یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ میں ادب و انشاء کا ذوق پیدا کیا جائے اور اُن کے کارناموں کو ملک سے روشناس کیا جائے۔ اسکی سالانہ قیمت ۴ ر رکھی گئی ہے جو کسی طرح زاید نہیں ہے۔ اس اشاعت میں جو ترجمے شایع ہوئے ہیں وہ صاف و سلیس ہیں اور پڑھنے کے قابل۔ میری رائے میں اگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ وہ کس افسانہ کا ترجمہ ہیں تو افادی حیثیت زیادہ بڑھ جاتی۔ غلام دستگیر تاجر کتب رحیم خاں بلڈنگ عابد روڈ حیدرآباد سے اس باب میں خط و کتابت کی جائے

ماہنامۂ دستکاری کے دو رسالے "الخضاب"۔ اور "سونا بنانا" ہمیں ملے ہیں جو ڈاکٹر شفیع احمد صاحب کی تصنیف ہیں۔ ایک میں تمام قدیم و جدید نسخے خضاب کے درج کر دئے ہیں اور دوسری میں بتایا گیا ہے کہ سونا بنانے کا دعویٰ کرنا یکسر مکر و فریب ہے، لیکن اس کے ساتھ بعض ترکیبیں ادنیٰ قسم کے پتھروں کو قیمتی پتھروں میں تبدیل کر دینے کی بھی درج کر دی ہیں

رسالہ دستکاری دہلی ایک زمانہ سے صنعت و حرفت کی خدمت انجام دے رہا ہے اور لوگ اس سے فایدہ اُٹھا رہے ہیں۔ جن حضرات کو ان باتوں سے دلچسپی ہو وہ اڈیٹر دستکاری۔ دہلی سے خط و کتابت کریں

مقدس ٹائم چارٹ روغنی نقشہ ہے جس میں آنحضرت کے تمام اہم واقعات زندگی کو ابتدا سے آخر تک بہت

خوش سلیقگی سے دکھایا گیا ہے۔ بعض بعض واقعات کو نقشوں سے بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ بچوں اور عورتوں کو سمجھانے کے لئے سیرت نگاری کا یہ طریقہ اچھا ہے۔ نذیر محمد خانصاحب مسکرا (ہمیر پور) سے خط و کتابت کی جائے۔ قیمت ۱۲ ر ہے۔

آگ ہفتہ وار اخبار ہے جو لکھنؤ کی سرد سرزمین سے حال ہی میں نکلنا شروع ہوا ہے، پریم بندھو صاحب اس کے ڈائرکٹر ہیں اور خلیق ابراہیم صاحب چیف اڈیٹر۔ سوشلسٹ خیال کی ترویج اس کا مقصد ہے اور ملک کی کامل آزادی اس کا نصب العین۔ مذہب انقلاب میں چونکہ یہ دونوں مقاصد "ایمان مجمل" کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان سے اختلاف کی جرأت شاید ہی کسی کافر کو ہو سکتی ہو

تمام مقالے، تمام نظمیں اور جملہ اداریہ تحریریں اسی مدعا کو سامنے رکھ کر پیش کی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام کارکن اپنے دلوں میں ملک و ملت کا غیر معمولی جوش رکھتے ہیں۔ ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی اس کو خصوصیت خاصہ حاصل ہے۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں لیکن معیاری نہیں۔ فلمی تصاویر سے اگر اس کو پاک رکھا جائے تو بہتر ہے۔

نمونہ دفتر آگ جھوائی ٹولہ لکھنؤ سے مل سکتا ہے

آئندہ جنوری ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذۂ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں نہ کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کلام پیش کیا اُن کو چھونے کی ہمت میر کو بھی نہیں ہوئی

تمام اُردو شعراء میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا بنا لیا۔ اس خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو مانوس بنا دینا کہ اس باب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہوگا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے:۔ (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات۔ (۲) مصحفی تذکرہ نگار کی حیثیت سے۔ (۳) مصحفی اور اس کے ہمعصر اساتذہ۔ (۴) مصحفی اور اس کے تلامذہ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر۔ (۶) مصحفی بحیثیت ایک انسان کے۔ (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے۔ (۸) مصحفی اور اصناف سخن وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ مضمون اور تصویر زیادہ سے زیادہ اکتوبر ۳۸ء کے آخر تک پہونچ جانا چاہئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

غزل:

اُمید امیٹھوی

روئی شبنم، گل ہنسا، غنچہ کھلا میرے لئے
جس سے جو کچھ ہو سکا اُس نے کیا میرے لئے

ہستیِ موہوم کا اُف رے فریبِ اعتبار
گرچہ سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہ تھا میرے لئے

جھاڑ کر پھر سے بچھائی جائے دُنیا کی بساط
پھر نئے سر سے قیامت ہو بپا میرے لئے

ہنسنے والے روئے اور رونے والے ہنس پڑے
دل کے ہاتھوں جو ہونا تھا ہوا میرے لئے

جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ تو سب کچھ ہو چکا
کیا وہ ہوگا جو نہ اب تک ہو سکا میرے لئے

کیا خبر جیتے ہیں اب اُمید کس اُمید پر
ایسے جینے سے تو مرنا سہل تھا میرے لئے

بہکی بہکی باتیں

پھر مری تنہائیاں ہیں اور میں،
سُونی بزم آرائیاں ہیں اور میں

چاند چُپ، ساکت ہوا، شاعر خموش
سامنے پرچھائیاں ہیں اور میں

دُنیائے تصور میں جو کھو جاتا ہوں
اِک آئینۂ خیال ہو جاتا ہوں

کٹتے نہیں جب رات کے ساکت لمحے
تقدیر پہ روتا ہوا سو جاتا ہوں،

ہم اُنھیں جی سے بھلائے جائیں گے
وہ ہمیشہ یاد آئے جائیں گے

چند "وعدے" چند جملے ناتمام
نت نیا جادو جگائے جائیں گے

ایس۔ امیٹھوی

غزل :- ہادی مچھلی شہری

ہے یہ مشکل کہ موت دور نہیں،
ورنہ جینا کوئی ضرور نہیں

شوق کی خامکاریوں کے سبب
دل ہے مجبور، نا صبور نہیں،

خود پرستی بھی میری کیا کم ہے
میری جنت میں کوئی حور نہیں،

بیدلی کو خدا کرے غارت
اب طبیعت میں وہ سرور نہیں

ہم نے مانا کہ دور ہے منزل
شوق اگر ہو تو کچھ بھی دور نہیں

عشق کی بے خودی، معاذ اللہ!
اب مجھے ہوش کا غرور نہیں

جلوہ خارا گداز تھا اُس کا
طور کا اس میں کچھ قصور نہیں

حُسن اور جلوہ ہائے رنگا رنگ
عشق اور کچھ اُسے شعور نہیں

ڈھونڈھ ہادی دلِ حزین و خراب
ورنہ جینے میں کچھ سرور نہیں

غزل :- دل شاہجہانپوری

اب تو اُس مرحلہ کا ہے آغاز
نہ رہا اعتبارِ محرم راز

روح پُر کیف ہو نظر کی طرح
مُطربِ مستِ ناز چھیڑ وہ ساز

سرگزشت اُس نظر کی طولانی،
جس نظر سے ہے عشق کا آغاز

گونجتی ہے ابھی صدائے الست
سُن رہا ہوں فضا میں وہ آواز

نہ رہا فرق عابد و معبود
عشق کی بندگی بھی ہے اک راز

کیوں نہ ہوں مائلِ ترانۂ عشق،
پندِ واعظ میں ہے نہ سوز نہ ساز

ان حدوں سے گزر چکا ہے دل،
اب نہیں شکوۂ نشیب و فراز

صبحِ پیری ہے شمعِ بزمِ خموش
ختم کر داستانِ سوز و گداز

فطرتِ عشق پر نظر اے دل،
شمع کی زندگی ہے سوز و گداز